جلد ۸۵ اگست ۱۹۷۶ء عدد ۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ضروری اعلان

ترجمہ قرآن مجید کی طباعت مکمل ہو گئی ہے۔ جلد بندی کا کام شروع ہے
خریدار اور ایجنٹ حضرات کے آرڈروں کی تعمیل اسی ماہ ترتیب وار کی جا رہی ہے

ناظم

ادارہ ترجمان القرآن

تفہیم القرآن مکمل سٹ (عام) دستیاب ہے تفصیل ملاحظہ ہو

تفہیم القرآن جلد اوّل	ہدیہ	۳۸/- روپے
″ ″ ″ دوم	″	۴۲/- ″
″ ″ ″ سوم	″	۴۵/- ″
″ ″ ″ چہارم	″	۳۸/- ″
″ ″ ″ پنجم	″	۳۸/- ″
″ ″ ″ ششم	″	۳۸/- ″

مکمل سٹ (عام) ہدیہ: ۲۳۹/- روپے

★

ادارہ ترجمان القرآن ۵۔ اے ذیلدار پارک۔ اچھرہ۔ لاہور

فون نمبر: ۴۱۱۰۱۶ — ۴۱۱۰۱۷

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۸۵ | اگست ۱۹۷۶ء مطابق شعبان ۱۳۹۶ھ | عدد ۶

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵۔اے ذیلدار پارک۔ اچھرہ۔ لاہور

فون نمبر: ۴۱۱۰۱۶ —— ۴۱۱۰۱۷

زرسالانہ بارہ روپے۔ فی پرچہ ۱/۲۵ روپیہ

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر: محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(قارئین ترجمان اس سے واقف ہیں کہ جناب پروفیسر عبدالحمید صدیقی صاحب ایک مدتِ مدید سے ترجمان القرآن کے اشارات سپردِ قلم کر رہے ہیں۔ بلا مبالغہ وہ اس گرانبار اور نازک ذمہ داری کے ہر طرح اہل ہیں اور امر واقعی یہ ہے کہ وہ اس خدمت کو اپنے دیگر کثیر علمی مشاغل کے ساتھ بحسن و بخوبی سرانجام دے رہے ہیں۔ لیکن وہ کچھ اچھی صحت کے مالک نہیں ہیں اور قارئین کرام کو یہ معلوم کر کے افسوس ہوگا کہ جون کے اوائل میں ان پر فالج کا حملہ ہوا جس سے وہ کئی روز تک اپنے گھر (گوجرانوالہ) میں صاحبِ فراش رہے۔ اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل و کرم ہے کہ مخلص و مشفق معالجین کے علاج سے ان کی طبیعت سنبھل گئی ہے اور اب چند روز سے انہوں نے لاہور میں آمد و رفت اور لکھنے پڑھنے کا ہلکا کام شروع کر دیا ہے۔ مگر ابھی تک ان کی صحت اس حد تک بحال نہیں ہو سکی کہ وہ اشارات رقم کر سکتے۔

میں نے عجلت و مشغولیت کے عالم میں اس مرتبہ بہرۂ اشارات کے اس اچانک پیدا شدہ خلا کو اپنی تحریر سے پُر کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہی ایام میں حکومت کی مقرر کردہ ایک کمیٹی برائے نسوانی حقوق کی رپورٹ پریس میں شائع ہوئی ہے جس کی بعض سفارشات بے حد محلِ نظر اور انتہائی غور و فکر کی محتاج ہیں۔ میں نے انہی کے ایک جزو پر اپنا تبصرہ و تجزیہ پیش کیا ہے۔

قارئین سے درخواست ہے کہ وہ محترم صدیقی صاحب کے حق میں صمیمِ قلب سے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ انہیں کامل صحت و توانائی عطا فرمائے تاکہ وہ بدستور اور تادیر اپنے قلم کو خدمتِ دین کے لیے رواں رکھیں اور ہم ان کی نگارشات سے مستفید ہوتے رہیں، آمین)

غلام علی

وزیر اعظم پاکستان نے جنوری ۱۹۷۶ء میں آنجہانی جنرل پاکستان کے زیر صدارت پاکستانی خواتین کے حقوق معین و مرتب کرنے کے لیے ۱۳ ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر فرمائی تھی۔ اس کمیٹی کی پیش کردہ رپورٹ کا ایک حصہ ۱۹ اور ۲۰ جولائی کے اخبارات میں شائع ہوا ہے جس کا مقصد اس پر ملک کی رائے عام اور ردِ عمل معلوم کرنا ہے۔ محترم صدر کمیٹی نے کراچی میں رپورٹ کو پریس کے حوالے کرتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ حکومت یا کمیٹی ہرگز ایسا کوئی قانون تجویز یا نافذ نہیں کرے گی جو قرآن و سنت کی تعلیمات کے خلاف ہو۔ تاہم بعض پہلوؤں میں اختلاف ممکن ہے اور ان کے بارے میں ہمارا دل کھلا ہے۔ ان کا یہ اعلان ہمارے لیے یک گونہ موجبِ اطمینان ہے اور ہم اس رپورٹ کے متعلق اپنی گزارشات پیش کریں گے۔ ہمیں امید ہے کہ ان پر کھلے دل سے اور قلب و نظر کی وسعت کے ساتھ غور کیا جائے گا، اور ان میں اگر رپورٹ کے کسی جز سے اظہارِ اختلاف ہوگا یا کسی غلطی کی نشان دہی کی جائے گی تو اسے نظر انداز کرنے یا ناگواری محسوس کرنے کے بجائے اس سے استفادہ کیا جائے گا۔

اس حقیقت سے تو انکار ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک مدتِ دراز سے چونکہ ہمارے ہاں اسلامی قوانین معطل اور اسلام کا عادلانہ اجتماعی نظام منہدم ہو چکا ہے، اس لیے مسلمان معاشرے کا ہر فرد اور ہر طبقہ بے چینی اور اضطراب کا شکار اور اصلاحِ حال کا محتاج ہے۔ لیکن اوّلین اور بنیادی سوال جو اس ضمن میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ آیا ہم اپنے امراض کا مداوا، اپنی مشکلات کا ازالہ اور اپنی تعمیرِ نو کا آغاز اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کرنا چاہتے ہیں یا جدید مغربی تہذیب و تمدن کے نظریات و عملیات کو اپنا رہنما بنانا چاہتے ہیں؟ اس سوال کا جواب یقیناً یہی ہے کہ ہمارا ہر اصلاحی و تعمیری قدم اللہ اور اس کے رسولؐ کے بتائے ہوئے طریق کے مطابق اُٹھنا چاہیے اور خود جناب اٹارنی جنرل کا ارشاد بھی یہی ہے کہ کوئی سفارش یا قانون سازی قرآن و سنت کے خلاف نہ ہوگی۔ یہ بات بھی ظاہر ہے کہ کسی چیز کے قرآن و سنت کے مطابق یا مخالف ہونے کا صحیح اور بہتر فیصلہ وہی کر سکتا ہے جو قرآن و سنت کا علم رکھتا ہو یا جسے ایسا علم رکھنے والے کا مشورہ و تعاون حاصل ہو۔ حقوقِ خواتین کی تعیین کرنے والی اس معزز کمیٹی کے ارکان کے نام درج ذیل ہیں:

۱۔ بیگم نسیم جہاں - ایم۔ این۔ اے
۲۔ بیگم ریحانہ سرور، ایم۔ پی۔ اے۔
۳۔ بیگم سمیعہ عثمان سابق سینیٹر
۴۔ بیگم رشیدہ پٹیل کونسل حکومت پاکستان۔

۵۔ بیگم نسیم سلطانہ ایڈووکیٹ۔ ۶۔ مس فاضلہ علیانی، ایم۔ پی۔ اے۔

۷۔ مسٹر ڈی۔ ایم۔ اعوان ایڈووکیٹ جنرل پنجاب۔ ۸۔ مسٹر غلام علی میمن ایڈووکیٹ جنرل سندھ۔

۹۔ مفتی محمد ادریس ایڈووکیٹ جنرل سرحد۔ ۱۰۔ بیگم زری سرفراز، مردان۔

۱۱۔ مسٹر محمد حیات جنیجو ایڈووکیٹ کراچی۔ ۱۲۔ مسز مریم حبیب ایڈیٹر شعبہ خواتین پاکستان ٹائمز۔

۱۳۔ مسز میرا فیلبس، پرنسپل کینیرڈ کالج، لاہور۔

ڈاکٹر مسز پروین شوکت علی، محکمہ تعلیم پنجاب اور مسز سی۔ اے۔ رحمٰن بھٹی اور جی۔ الیس گھنگرد سکرٹری و ڈپٹی سکرٹری لا ڈویژن کمیٹی کے مشیر اور سکرٹری ہیں۔

ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اس پورے زمرۂ ارکان میں سے کتنے صاحبان یا صاحبات ایسی ہیں جو قرآن وسنت کا برائے نام علم ہی رکھتی ہوں؟ کتاب وسنت کے ضروری علم سے بہرہ مند نہ ہونے کے باوجود اجتہاد کا منصب سنبھال لینے اور مسلم لا کی تشریح اور اس میں ترمیم وتنسیخ کی کوشش کرنے کا نتیجہ سوائے اس کے اور کیا نکل سکتا ہے کہ مسلمان معاشرے کے بگاڑ اور خلفشار وانتشار میں اگر کوئی کسر باقی رہ گئی ہے تو اسے بھی پورا کر دیا جائے۔ اسلامی قانون کا جو حصہ بالخصوص مسلمانوں کی ازدواجی وعائلی زندگی سے تعلق رکھتا ہے وہ ان کی تہذیب وتمدن کا سنگ بنیاد ہے۔ کوئی مسلمان فرد خواہ وہ عورت ہو یا مرد، قانون کے اُس دائرے سے خارج نہیں ہے جو ازدواجی تعلقات اور حقوق وفرائض کو منضبط کرنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ رشتۂ ازدواج کا نہایت گہرا اور دور رس تعلق ایک مسلمان شوہر اور مسلمان بیوی کے دینی احساسات و معتقدات، عصمت وعفت کے احساسات اور نسب کی حلت وحرمت کے تصورات سے ہے۔ کوئی حکومت یا اس کی قائم کردہ کوئی کمیٹی اگر من مانے طریق پر کسی خاص طبقے مثلاً مزدوروں، کسانوں یا کارخانوں اور دفاتر میں کام کرنے والے ملازمین کے کچھ حقوق متعین کر دے اور ان کا قانونی نفاذ ہو جائے تو اس سے مسلمان معاشرے کی پوری اخلاقی ومعاشرتی زندگی اس طرح متاثر نہیں ہو سکتی جس طرح "عورتوں کے حقوق" کی پُر فریب اصطلاح استعمال کرتے ہوئے اُس دائرۂ قوانین میں رد وبدل سے ہوتی ہے جس کا تعلق نکاح، طلاق، خلع، نان ونفقہ وغیرہ کے شخصی معاملات سے ہے۔ مسلم معاشرے کے مرد وزن کی اِس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان کی حیاتِ عائلیہ کے متعلق اسلام کے صریح اور واضح قوانین سے انحراف

کر کے ان پر غیر اسلامی، غیر فطری اور غیر معقول قوانین نافذ کرنے کی کوشش یا سفارش کی جائے۔

جو بات اُوپر تمہیدی اور اجمالی طور پر کہی گئی ہے، اس کی وضاحت میں اب ہم ایک ترتیب کے ساتھ کمیٹی کی چند سفارشات اور ان پر اپنا تبصرہ پیش کریں گے تاکہ ہمارا مدعا و منشا پوری طرح کمیٹی کے ارکان اور عام قارئین کے سامنے آ جائے۔ کمیٹی نے اپنی رپورٹ کے آغاز میں کچھ عمومی سفارشات اور مسلم فیملی لاز آرڈیننس ۱۹۶۱ء میں کچھ رسمی ترمیمات دفعہ ۳۱ تک پیش کی ہیں۔ اس کے بعد دفعہ ۳۲ سے لے کر دفعہ ۴۳ تک جو سفارشات تجویز کی گئی ہیں ان کے بغور مطالعے سے یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ ان سفارشات کا نہایت واضح مقصد یہ ہے کہ اسلام نے نکاح کی گرہ کھولنے کا اختیار جس طرح مرد کو دیا ہے، اُسی طرح یہ اختیار عورت کو بھی دے دیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں یہ تجویز کیا گیا ہے کہ جس طرح مرد عورت کو طلاق دے سکتا ہے، اُسی طرح عورت کو بھی اپنے خاوند کو طلاق دینے کا حق دیا جائے۔ صرف یہی نہیں بلکہ مزید ستم ظریفی یہ ہے کہ جو عورت پانچ سال تک ایک مرد کے نکاح میں رہے، وہ قیدِ نکاح سے آزاد ہو جانے کے بعد بھی سابق خاوند کی جائداد میں حصہ دار قرار پائے۔

اس کمیٹی کی دلی خواہش اور تمنا تو یہی ہے کہ عورت جب چاہے اپنے خاوند کو طلاق دے سکے اور قانون اس میں اس کی پوری مدد کرے، لیکن کمیٹی کے ارکان اپنے دل کی بات کو صاف الفاظ میں بیان نہیں کرنا چاہتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں (یا جانتی ہیں) کہ کوئی خدا سے ڈرنے والی غیرت مند مسلم خاتون اس قانونی اجازت سے بمشکل فائدہ اٹھانے پر رضامند ہو گی اور کوئی ادنیٰ دینی حس رکھنے والا مسلمان مرد ایسی عورت کو غیر منکوحہ یا مطلقہ سمجھ کر ہرگز اُسے اپنی زوجیت میں قبول نہیں کرے گا۔ چنانچہ اس تلخ بلکہ سخت نجس و ناپاک گولی کو مسلمانوں کے حلق سے زبردستی نیچے اُتارنے کے لیے کمیٹی کے ارکان عورت کے اس مزعومہ حقِ طلاق کو کبھی خلع اور کبھی عدالتی تفریق و تنسیخ کے غلاف میں لپیٹنے کی ناکام سعی کر رہے ہیں اور ان کے بیان و استدلال میں عجیب تضاد اور ژولیدگی پیدا ہو گئی ہے۔

پہلے وہ دفعہ ۳۳ میں فرماتے ہیں:

"بیوی اگر مسلم لا کے تحت خلع حاصل کرنے کی مستحق ہو اور خاوند کو مالی معاوضہ دینے پر تیار ہو تب

بھی اُسے تفریقِ نکاح کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے عدالت سے رجوع کرنا پڑتا ہے"۔

اس فقرے کے فوراً بعد دوسرا فقرہ یہ ہے:

"مسلم لا کے تحت جو عورت خلع کے اصول پر تفریقِ نکاح کا مطالبہ کرے اور خاوند کو مالی معاوضہ دینے پر تیار ہو تو اُسے اپنا "حقِ تفریقِ نکاح" استعمال کرنے کے لیے عدالت یا قاضی کے سامنے جانے کی ضرورت نہیں ہے"۔

یہ دونوں باتیں اور "مسلم لا" کی یہ تعبیریں باہم متصادم و متناقض ہیں۔ البتہ ان میں کسی حد تک تطبیق کی ایک صورت سمجھ میں آتی ہے اور وہ یہ کہ یوں فرض کر لیا جائے کہ پہلے فقرے میں "مسلم لا" سے مراد رائج الوقت قانون ہے اور دوسرے میں "مسلم لا" سے مراد اسلامی قانون کا وہ تصور ہے جو کمیٹی کے ارکان کے ذہن میں ہے اور جسے وہ صحیح اسلامی قانون سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ اُلجھن باقی رہتی ہے کہ رپورٹ کے مرتبین دانستہ یا نادانستہ طور پر خلع اور عدالتی تفریق کو ہر حیثیت سے بالکل ایک شے قرار دے رہے ہیں اور دونوں کو غلط ملط کر کے غلط استدلال اور غلط اعتراض وضع کر رہے ہیں۔ حالانکہ اسلامی تعلیمات کی رو سے نہ ہر عدالتی تفریق خلع کی تعریف میں آتی ہے، نہ ہر خلع میں عدالتی کارروائی ضروری ہوتی ہے۔ فقہائے اسلام کے نزدیک خلع کی تعریف یہ ہے کہ مہر یا اس سے کم و بیش مالی بدل کے عوض میں خاوند لفظ "خلع" یا اس کے ہم معنی الفاظ کے ساتھ نکاح کو زائل کر دے اور عورت اِس ازالۂ نکاح بالمال کی پیش کش کو قبول کر لے۔ خلع میں عدالت سے رجوع ضروری نہیں، صرف مال کے بدلے میں عورت کی طرف سے قبولیت شرط ہے۔ اگر زوجین باہمی رضامندی سے خلع کر لیں تو قانونِ شریعت یا رائج الوقت قانون، دونوں میں سے کوئی ایک بھی ان کی راہ میں حائل نہیں۔ خاوند اگر خلع یا طلاق پر آمادہ نہ ہو اور بیوی خاتمۂ نکاح پر مصر ہو، تب وہ عدالت سے تنسیخ و تفریق کا فیصلہ حاصل کرے گی اور ایسی صورت میں بھی قانونِ شریعت یا مروّج قانون اس کا راستہ نہیں روک سکتا۔ مرد اگر طلاق یا خلع کے ذریعے سے نکاح کو زائل نہ کرے تو عورت کے لیے قانوناً یا شرعاً عدالت سے رجوع ناگزیر ہے۔ لیکن کمیٹی کے ارکان کا کہنا یہ ہے کہ اس صورت میں بھی عدالت یا قاضی کے سامنے جانا ضروری نہیں ہے۔ اپنے اس دعوے کے حق میں وہ امام شعرانی کی المیزان الکبریٰ کی درج ذیل عبارت نقل کرتے ہیں:

"ائمہ کا اتفاق ہے کہ اگر بیوی شوہر کو ناپسند کرے تو وہ مالی بدل ادا کر کے خلع حاصل کر سکتی ہے"۔

اس وقت امام شعرانی کی یہ کتاب ہمارے سامنے نہیں ہے لیکن بالفرض اگر انہوں نے ایسا لکھا ہے تو اس سے مراد وہ صورت ہے جبکہ باہمی مفاہمت کے نتیجے میں خاوند خلع پر تیار ہو۔ اس کا یہ مطلب کیسے ہوسکتا ہے کہ خاوند کی عدم آمادگی میں بھی عدالت سے تنسیخ نکاح کرانا ضروری نہیں اور عورت جس خاوند کو ناپسند کرے اُسے خود ہی فارغ خطی کی رسید دے اور جہاں جی چاہے چلی جائے۔

اس کے بعد رپورٹ میں سورۂ بقرہ آیت ۲۲۹ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ آیت یہ ہے:

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَأْخُذُوا مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا إِلَّا أَنْ يَخَافَا أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ ۖ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ۔

(اور تمہارے لیے جائز نہیں ہے کہ جو کچھ تم ان عورتوں کو دے چکے ہو اس میں سے کچھ واپس لو، اِلّا یہ کہ دونوں کو اللہ کی حدود پر قائم نہ رہ سکنے کا خوف ہو۔ پس اگر تمہیں خوف ہو کہ وہ دونوں حدود اللہ کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ عورت کچھ معاوضہ دے کر علیحدگی اختیار کرے)۔

اس آیت سے بھی عدالتی کارروائی کی قطعی نفی یا عدم لزوم کا ثبوت نہیں ملتا۔ بلکہ آیت سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ اگر زوجین کے درمیان گھر کے گھر ہی میں کوئی بات طے ہو جائے تو جو مالی معاوضہ طے ہوگا، وہی نافذ ہوگا۔ لیکن معاملہ عدالت میں جائے تو عدالت اس امر کی تحقیق کرے گی کہ آیا فی الواقع عورت مرد سے اس حد تک متنفر ہو چکی ہے کہ اس کے ساتھ نباہ نہیں ہوسکتا اور حدود اللہ کی پامالی کا خدشہ ہے تو عدالت کو اختیار ہے کہ جو فدیہ یا معاوضہ چاہے تجویز کرے اور خاوند سے خلع دلوائے یا تنسیخ نکاح کا فیصلہ کردے۔ عجیب بات ہے کہ کمیٹی اس آیت سے عدالتی کارروائی کا غیر ضروری ہونا ثابت کرنا چاہتی ہے حالانکہ اس میں تمہیں کا خطاب زوجین کے ماسوا ایک فریق ثالث سے ہے جو عدالت سے رجوع کا ایک واضح قرینہ ہے۔ خود عبد اللہ یوسف علی کا جو ترجمہ رپورٹ میں نقل ہوا ہے اس میں بھی تم سے مراد قوسین میں قاضی لیا گیا ہے If ye (judges) do fear ...... ۔ اس کے بعد بھی حیرت ہے کہ اس آیت کو من گھڑت معنی پہنائے جا رہے ہیں اور تفریق نکاح کے لیے قضائے قاضی کو غیر ضروری قرار دے کر عورت کو ازالۂ نکاح کا یک طرفہ حق بخشا جا رہا ہے۔

اس آیت کے بعد رپورٹ میں حضرت ثابتؓ بن قیس کا واقعہ حدیث سے نقل کیا گیا ہے لیکن اس حدیث سے بھی وہ بات ثابت نہیں ہو سکتی جو رپورٹ تیار کرنے والوں کے پیش نظر ہے کیونکہ اس حدیث کے آخری الفاظ جو رپورٹ میں بھی موجود ہیں، یہ ہیں:

”نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ثابتؓ سے کہا کہ اپنا باغ واپس لے لو اور عورت کو طلاق دے کر قید نکاح سے آزاد کر دو۔ چنانچہ ثابت نے ایسا ہی کیا۔“

اس حدیث سے تو اُلٹا اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ نکاح کی گرہ خاوند ہی کے ہاتھ میں ہے اور عدالت پہلے خاوند کو طلاق یا خلع کا حکم دے گی اور چاہے تو مالی معاوضہ بھی طے کرے گی۔ اگر خاوند مان جائے تو فبہا ورنہ عدالت نکاح کو کالعدم کرے گی۔ اس سے یہ مطلب کب نکلا کہ عورت نکاح کا خاتمہ خود کر دے گی اور عدالت کا کام فقط اس پر مہر توثیق لگانا اور مالی بدل طے کرنا ہے۔

یہ مختصر بحث ہی اس امر کا اندازہ کرنے کے لیے بالکل کافی ہے کہ اس ایک آیت قرآنی، ایک حدیث اور ایک فقہی قول سے جو استنباط و استدلال کمیٹی کے ارکان نے کیا ہے وہ کہاں تک روا اور درست ہے اور اس کے بعد دفعہ ۳۵ میں بیان کردہ یہ دعویٰ کس حد تک حق بجانب ہے کہ:

”کمیٹی کی رائے یہ ہے کہ کوئی وجہ نہیں کہ ایک مسلم خاتون کو یہ ثابت کرنے کے لیے عدالت کے سامنے جانے پر مجبور کیا جائے کہ وہ اور اس کا خاوند حدود اللہ کو قائم رکھتے ہوئے باہم نباہ نہیں کر سکتے اور مالی بدل کے عوض میں تنسیخ نکاح کا فیصلہ عدالت کو صادر کرنا چاہیے۔ مسلم لا کے تحت عورت خلع کے ذریعے سے خاوند سے علیحدگی حاصل کر سکتی ہے اور اب وقت آگیا ہے کہ اس حق کو قانوناً تسلیم کیا جائے۔“

ہم اس حقیقت کو واضح کر چکے ہیں کہ یہ خواہ مخواہ کا خلطِ مبحث ہے جو عورت کو نام نہاد حقِ طلاق عطا کرنے کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔ ہم بھی اس بات کو مانتے ہیں کہ باہمی افہام و تفہیم اور سمجھوتے کے ذریعے سے اگر خاوند طلاق یا خلع بالمال پر راضی ہو جائے تو عدالتی چارہ جوئی کے بغیر بھی خاتمۂ نکاح ہو سکتا ہے، بلکہ اسلام اسی بات کو پسند کرتا ہے کہ گھریلو زندگی کے گندے چیتھڑے عدالت میں نہ دھوئے جائیں تو بہتر ہے۔ مگر اس حق کو قانونی طور پر تسلیم کرنے کا وقت اب نہیں آیا بلکہ یہ حق چودہ سو سال سے قانوناً و شرعاً مسلّم ہے کہ طلاق یا خلع یا ازالۂ نکاح کے لیے یا مال کی مقدار معین کرنے کے لیے (باقی بر صفحہ ۴۶)

باب (۱۰)

سنہ ۶ بعدِ بعثت سے سنہ ۱۰ بعدِ بعثت تک

ہجرت حبشہ کے بعد مکہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بہت کم لوگ باقی رہ گئے تھے جن میں چند خواتین بھی تھیں۔ دشمنانِ اسلام پر اس وقت ایک تو ہجرت کی جھنجھلاہٹ طاری تھی، اور اس پر مزید غصے کا اضافہ اِس بات سے ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کو حبش میں اچھی پناہ گاہ مل گئی تھی اور مشرکین کا وفد وہاں سے ناکام و نامراد واپس آیا تھا۔ اس حالت میں وہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دست درازیاں کرنے سے بھی نہ چوکے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قریش کی دست درازیاں

بخاری میں حضرت عُروہؓ بن زبیر کی روایت ہے کہ میں نے حضرت عبداللہؓ بن عَمرو بن عاص سے پوچھا کہ آپ نے مشرکین کا سب سے زیادہ سخت برتاؤ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا دیکھا ہے۔ انہوں نے کہا ایک روز آپؐ کعبہ کے صحن میں (اور ایک روایت میں ہے کہ حِجرِ کعبہ میں) نماز پڑھ رہے تھے۔ یکایک عُقبہ بن ابی مُعیط آگے بڑھا اور اُس نے آپؐ کی گردن میں کپڑا ڈال کر اُسے بل دینا شروع کر دیا تاکہ گلا گھونٹ کر آپؐ کو مار ڈالے۔ مگر عین وقت پر حضرت ابوبکرؓ پہنچ گئے اور انہوں نے دھکا دے کر اسے ہٹا دیا۔ حضرت عبداللہؓ کا بیان ہے کہ جس وقت ابوبکر صدیقؓ اُس ظالم سے کشمکش کر رہے تھے، اس وقت اُن کی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے کہ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ یَّقُوْلَ رَبِّیَ اللّٰہُ ؟ "کیا تم ایک شخص کو صرف اس قصور میں مارے ڈالتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے ؟"۔ ابن جریر نے اپنی تاریخ میں یہی واقعہ ابوسلمہ بن عبدالرحمن کے حوالہ سے روایت کیا ہے۔ لیکن نسائی اور ابن ابی حاتم نے اِسے حضرت عبداللہ کے بجائے اُن کے والد حضرت عمروؓ بن عاص سے کچھ لفظی اختلاف کے ساتھ نقل کیا ہے اور اس میں عُقبہ بن ابی مُعیط کے بجائے یہ ذکر ہے کہ قریش کے لوگوں نے یہ حرکت کی تھی، اور حضرت ابوبکرؓ روتے ہوئے حضورؐ کو بچاتے جاتے تھے اور یہ الفاظ کہتے جاتے تھے۔

امام بخاریؒ نے یہ قصہ کئی جگہ اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔ کسی جگہ روایت حضرت عمروؓ بن العاص سے

ہے اور کسی جگہ حضرت عبد اللہؓ بن عمروؓ بن العاص سے[1]۔ ایک جگہ حضرت عمروؓ ابنُ العاص کی روایت یہ ہے کہ میں نے کبھی قریش کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا ارادہ کرتے نہیں دیکھا، سوائے ایک مرتبہ کے۔ وہ لوگ کعبہ کے سایہ میں بیٹھے تھے اور حضورؐ مقام ابراہیم پر نماز پڑھ رہے تھے۔ اتنے میں اُنہوں نے ایک دوسرے کو آپؐ کے خلاف بھڑکایا۔ آخر عُقبہ بن ابی مُعَیط اُٹھا اور اُس نے اپنی چادر آپؐ کے گلے میں ڈال کر کھینچنا شروع کیا یہاں تک کہ آپؐ گھٹنوں کے بل گِر گئے اور لوگوں میں شور مچ گیا۔ اُس وقت حضرت ابوبکرؓ دوڑتے ہوئے آئے اور آپؐ کا بازو پیچھے سے تھام لیا اور کہنے لگے "کیا تم ایک شخص کو صرف اس قصور میں مارے ڈالتے ہو کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے؟" پھر لوگ آپؐ کے پاس سے ہٹ گئے۔ نماز سے فارغ ہو کر جب آپؐ قریش کے لوگوں کے پاس سے گزرے تو فرمایا "قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں تمہاری طرف ذبح کے ساتھ بھیجا گیا ہوں"۔ اس پر ابوجہل بولا "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، تم تو کبھی نادان نہ تھے"۔ حضورؐ نے فرمایا اور تم انہی میں سے ہو۔ (ابویَعلیٰ، ابن حِبّان، طَبَرانی اور بَیہقی نے بھی یہ قصہ حضرت عمروؓ بن العاص کی روایت سے نقل کیا ہے)۔

صحیح بخاری کی دوسری روایت میں یہ ہے کہ مشرکین نے حضورؐ کی ڈاڑھی اور سر کے بال نوچ ڈالے اور اکثر بال اکھڑ گئے۔ حضرت ابوبکرؓ آپ کی حمایت کے لیے اُٹھے اور وہ روتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ "کیا تم ایک شخص کو صرف اس قصور میں مارے ڈالتے ہو کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے کہا "چھوڑ دو انہیں اے ابوبکرؓ، قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں اِن کی طرف ذبح کے ساتھ ہی بھیجا گیا ہوں"۔ یہ سُن کر ساری بھیڑ آپؐ کے پاس سے چھٹ گئی۔

ابن ہشام، ابن جریر طَبَری اور بَیہقی نے ابن اسحاق کی سند سے یہ واقعہ لکھا ہے کہ عُروَہ بن زبیر نے حضرت عبد اللہؓ بن عمرو بن عاص سے پوچھا کہ قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت کا جو اظہار کرتے

---

[1] صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصل روایت حضرت عمروؓ بن عاص کی ہے، اور حضرت عبد اللہؓ بن عمرو نے غالباً اپنے والد سے سُنی ہوئی روایت بیان کی ہے۔ کیونکہ حضرت عبد اللہؓ بن عمرو نے سنہ ۶۵ھ میں وفات پائی۔ وفات کے وقت ان کی عمر ۷۲ سال تھی۔ اس حساب سے دیکھا جائے تو وہ اِس واقعہ کے عینی شاہد نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ ان کی پیدائش ہجرت سے سات سال پہلے، یعنی سنہ ۶ بعد بعثت میں ہوئی تھی۔

تھے اُس میں سے شدید ترین واقعہ آپ نے کیا دیکھا ہے؟ انہوں نے کہا میں ایک روز قریش کی مجلس میں گیا ان کے سردار حِجر میں جمع تھے۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہا کہ اِس شخص کے معاملہ میں ہم نے جتنا صبر کیا ہے اُتنا صبر کرتے ہوئے ہم نے کسی کو نہیں دیکھا۔ اِس نے ہماری عقلوں کو حماقت ٹھیرایا، ہمارے باپ دادا کی بُرائی کی، ہمارے دین کی عیب جوئی کی اور ہماری جماعت میں تفرقہ ڈال دیا۔ حقیقت میں ہم نے بہت بڑی بات پر صبر کیا ہے۔ اِس اثناء میں کہ وہ یہ باتیں کر رہے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نمودار ہوئے۔ چلتے ہوئے آگے بڑھ کر آپ نے حجرِ اسود کو بوسہ دیا، پھر کعبہ کا طواف کرتے ہوئے ان کے پاس سے گذرے۔ اُنہوں نے آپ پر ایک چبھتا ہوا فقرہ کسا اور میں نے حضورؐ کے چہرے پر اس کا ناگوار اثر محسوس کیا۔ پھر دوسری مرتبہ آپ گذرے۔ اُنہوں نے پھر آوازہ چُست کیا اور میں نے محسوس کیا کہ آپ کو وہ ناگوار گذرا ہے۔ تیسری مرتبہ جب آپ گذرے اور انہوں نے یہی حرکت کی تو آپ رُک کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا "قریش کے لوگو سنتے ہو؟ قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں تمہارے پاس ذبح لے کر آیا ہوں"۔ عبداللہ بن عمروؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ کی اِس بات پر سب لوگ سُن ہو کر رہ گئے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں۔ پھر ان میں سے جو سب سے زیادہ بڑھ بڑھ کر بول رہا تھا اُس نے آپ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ایسی باتیں کرنی شروع کر دیں جو وہ اپنے نزدیک بہتر سے بہتر پاتا تھا، یہاں تک کہ اُس نے کہا "اے ابوالقاسمؐ، اچھی طرح گذر جاؤ، خدا کی قسم، تم تو کبھی نادان نہ تھے"۔ چنانچہ حضورؐ وہاں سے پلٹ گئے۔ دوسرے روز پھر یہ لوگ حِجر میں جمع ہوئے اور میں ان کے ساتھ تھا۔ انہوں نے آپس میں کہا "کچھ یاد ہے کہ یہ شخص تمہارے معاملے میں کہاں تک بڑھ گیا ہے؟ حتیٰ کہ اِس نے وہ بات تم کو کُھل کر کہہ دی جو کل کہی تھی اور پھر تم نے اسے چھوڑ دیا"۔ اِتنے میں حضورؐ سامنے سے آتے نظر آئے۔ آپ کے آتے ہی سب یک بارگی آپ پر جھپٹے اور آپ کو گھیر کر کہنے لگے "تم ہی ہو جو یہ اور یہ کہتے ہو؟" آپ نے فرمایا "ہاں میں ہی ہوں جو یہ کہتا ہوں"۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ ان میں سے ایک شخص نے آپ کی چادر کو گریبان کے پاس سے پکڑ کر مُٹھی میں لے لیا۔ اس پر ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ کی حمایت کے لیے اُٹھے۔ وہ روتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ "کیا تم ایک شخص کو صرف اس قصور میں مارے ڈالتے ہو کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے"؟ اس کے بعد لوگ آپ کو چھوڑ کر چلے گئے۔ یہ ہے شدید ترین معاملہ جو میں نے قریش کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کرتے دیکھا ہے۔ المسند احمد میں بھی یہ واقعہ اسی طرح درج ہے۔

حضرت حمزہؓ کا اسلام

اسی زمانے میں ایک روز ایک ایسا واقعہ پیش آگیا جس نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو اسلام کے دائرے میں داخل کر دیا۔ مؤرخین کے درمیان اُن کے مسلمان ہونے کی تاریخ میں اختلاف ہے۔ ابن حجرؒ نے اصابہ میں سنہ۲ بعد بعثت تاریخ لکھی ہے۔ ابن عبد البرؒ نے پہلے سنہ۲ لکھنے کے بعد پھر لکھا ہے کہ "کہا گیا ہے کہ وہ سنہ۶ بعد بعثت میں حضورؐ کے دار الارقم میں داخل ہونے کے بعد مسلمان ہوئے۔ مگر ابن سعد، ابن الجوزی اور العتقی نے اس کا زمانہ قطعیت کے ساتھ سنہ۶ بعد بعثت ہی بتایا ہے۔ ابن القیمؒ نے بھی زاد المعاد میں اس کا ذکر ہجرت حبشہ ثانیہ کے بعد کیا ہے اور یہی ابن اثیر کی تاریخ الکامل میں ہے۔ علاوہ بریں جو واقعہ حضرت حمزہؓ کے اسلام کا موجب بنا وہ بھی بجائے خود یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ سنہ۲ بعد بعثت میں پیش نہیں آسکتا تھا، بلکہ قریش اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کشمکش بہت زیادہ بڑھ جانے کے بعد ہی اُس کا پیش آنا ممکن تھا۔ سنہ۲ بعد بعثت میں ابوجہل کی کیا مجال تھی کہ وہ آپ کو گالیاں دیتا تو در کنار، آپ سے آنکھ بھی ملا سکتا۔

قصہ یہ ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بقول ابن اسحاق صفا کے پاس سے، اور بعض دوسرے اقوال کے مطابق حجون کے پاس سے گذر رہے تھے کہ ابوجہل نے آپ کو بے تحاشا گالیاں دیں اور آپ کی اور آپؐ کے لائے ہوئے دین کی شان میں بہت بُرے الفاظ استعمال کیے۔ مگر آپ نے اس کی کسی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اِس کی خبر ابن اسحاق کے بیان کے مطابق عبداللہ بن جُدعان (بنی تیم کے ایک رئیس) کی آزاد کردہ لونڈی نے، اور بقول بعض حضرت حمزہؓ کی بہن حضرت صفیہؓ نے، اور بروایتِ ابن ابی حاتم دو عورتوں نے حضرت حمزہؓ کو پہنچا دی۔ وہ قریش کے نہایت بہادر، طاقت ور اور خود دار آدمی تھے۔ حضورؐ کے چچا بھی تھے، دودھ شریک بھائی بھی تھے اور ان کی والدہ بی بی آمنہ کی چچا زاد بہن بھی تھیں۔ عمر بھی اُن کی حضورؐ سے دو چار سال ہی زیادہ تھی۔ آپؐ سے اُن کو بے حد محبت تھی۔ شکار کے شوقین تھے۔ تیر کمان لیے ہوئے واپس آرہے تھے کہ یہ قصہ سُنا۔ غصہ میں بھرے ہوئے حرم پہنچے جہاں ابوجہل بیٹھا تھا اور جاتے ہی کمان اس کے سر پر اس زور سے ماری کہ اس کا سر پھٹ گیا۔ پھر کہا "تو اُن کو گالیاں دیتا ہے، میں بھی اُنہی کے دین پر ہوں اور وہی کہتا ہوں جو وہ کہتے ہیں۔ اگر تجھ میں ہمت ہے تو وہی گالیاں ذرا مجھے دے کر دیکھ۔" اس پر بنی مخزوم کے کچھ لوگ ابوجہل کی حمایت کے لیے اُٹھے، مگر اس نے کہا، "ابو عُمارہ کو چھوڑ دو، میں نے واقعی اُن کے بھتیجے کو بُری طرح گالیاں دی تھیں۔" طبرانی اور ابن ابی حاتم کی روایت ہے کہ حضرت حمزہؓ نے فرمایا "میرا دین بھی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دین ہے، مجھے اس سے روک لو اگر تم سچے ہو۔"

یونس بن بکیرؒ صاحب المغازی نے ابن اسحاق کی سند سے اس قصے کی مزید تفصیل یہ دی ہے کہ حضرت حمزہؓ حمیت میں آکر یہ کام کر تو گئے مگر جب اپنے گھر پہنچے تو دل میں کہا "تو قریش کا سردار ہے، دین سے پھرے ہوئے اِس شخص کا پیرو بن گیا اور اپنے آبائی دین کو چھوڑ گیا۔ تیرے لیے موت اس کام سے بہتر ہے جو تو نے کیا ہے" پھر اللہ سے دعا کی کہ "خدایا، اگر یہ صحیح راستہ ہے تو اِس کی تصدیق میرے دل میں ڈال دے، ورنہ میرے لیے اس سے نکلنے کی کوئی راہ پیدا فرما دے"۔ اُس رات وہ وسوسۂ شیطانی سے سخت بے چین رہے یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔ پھر حضورؐ کے پاس پہنچے اور کہا "بھتیجے، میں ایک ایسے معاملہ میں پڑ گیا ہوں جس سے نکلنے کی کوئی صورت مجھے نظر نہیں آتی، اور مجھ جیسے آدمی کا کسی ایسی چیز پر قائم رہنا جس کے متعلق میں نہیں جانتا کہ وہ راستی ہے یا گمراہی، ایک شدید بات ہے"۔ حضورؐ نے یہ بات سن کر ان کو نصیحت کی، خدا کا خوف دلایا اور ایمان لانے پر بشارت دی۔ یہاں تک کہ اللہ نے ان کے دل میں ایمان ڈال دیا اور انہوں نے کہا "میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ صادق ہیں" (اس واقعہ کو بیہقی نے بھی بحوالۂ یونس بن بکیر ابن اسحاق سے نقل کیا ہے)۔

حضرت عمرؓ کا اسلام اس کے بعد دوسری اور زیادہ زبردست چوٹ قریش کو یہ لگی کہ ایک روز یکایک انہیں معلوم ہوا کہ عمرؓ بن خطاب بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے۔ وہ قریش کی مخالفتِ اسلام کے ستونوں میں سے ایک اہم ستون تھے۔ ایمان لانے والوں پر ظلم و ستم کرنے میں پیش پیش تھے۔ قریش میں ان کو بڑی اہم حیثیت حاصل تھی۔ انسابِ عرب کے علم میں ان کی شہرت تھی۔ قریش کی طرف سے سفارت کے منصب پر بھی وہ بھیجے جاتے تھے۔ قبائل کے درمیان مُنافرت اور مُفاخرت کی نوبت آتی تو ان کو حَکَم بنایا جاتا اور ان کا فیصلہ قبول کیا جاتا۔ قریش سے کوئی مفاخرت کرتا تو انہی کو جواب دینے کے لیے بھیجا جاتا۔ بہادر تھے۔ طاقتور تھے۔ شہسوار تھے۔ زبان آور تھے اور ان کی قوت کا لوہا مانا جاتا تھا۔ قریش کو یہ تصور بھی نہ تھا کہ ان جیسا آدمی بھی ایک روز اُن کے مقابلے میں اسلام کی علمبرداری کے لیے اٹھ کھڑا ہوگا۔ لیکن ایک تدریجی عمل اُن کے اندر ایسا ہو رہا تھا جو بالآخر انہیں اسلام کی طرف کھینچ لے گیا۔

اُن کا اوّلین تاثر ان کا پہلا تاثر وہ تھا جسے مسند احمد اور طبرانی میں خود اُن کی روایت سے نقل کیا گیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اسلام لانے سے پہلے ایک روز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ستانے کے لیے گھر سے نکلا، مگر آپ مجھ سے پہلے حرم میں داخل ہو چکے تھے۔ میں پہنچا تو آپ نماز میں سورۂ الحاقّہ پڑھ رہے تھے۔ میں آپ کے پیچھے کھڑا ہوگیا اور سننے لگا۔ قرآن کی شانِ کلام پر میں حیران ہو رہا تھا کہ میرے دل میں یکایک

یہ خیال آیا کہ یہ شخص ضرور شاعر ہے جیساکہ قریش کہتے ہیں۔ فوراً ہی حضوؐر کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے کہ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۔ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ "یہ ایک رسول کریم کا قول ہے، کسی شاعر کا قول نہیں ہے۔ تم لوگ کم ہی ایمان لاتے ہو" (آیات ۴۰-۴۱)۔ میں نے اپنے دل میں کہا شاعر نہیں تو پھر کاہن ہے۔ اسی وقت زبانِ مبارک پر یہ الفاظ جاری ہوئے وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۔ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۔ "اور نہ یہ کسی کاہن کا قول ہے۔ تم لوگ کم ہی غور کرتے ہو"۔ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ "یہ رب العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے"۔ (آیات ۴۲-۴۳)۔ یہ سن کر اسلام میرے دل میں گہرا اُتر گیا۔[1]"

اُن پر ہجرتِ حبشہ کا اثر

اُن کا دوسرا تاثر وہ تھا جسے ابن اسحاق کے حوالے سے ابن ہشام نے سیرت میں طبری نے تاریخ میں اور ابن اثیر نے اُسد الغابہ میں حضرت لیلیٰ بنتؓ ابی حثمہؓ کی روایت سے نقل کیا ہے۔ یہ حضرت عمرؓ کی قریبی رشتہ دار تھیں اور اپنے شوہر حضرت عامرؓ بن ربیعہؓ العنزی کے ساتھ حبش کی طرف ہجرت کر گئی تھیں۔ وہ بیان کرتی ہیں کہ میں ہجرت کے لیے اپنا سامان باندھ رہی تھی اور میرے شوہر عامر بن ربیعہ کسی کام سے باہر گئے ہوئے تھے۔ اتنے میں عمر آئے جبکہ وہ اپنے شرک پر قائم تھے اور ہم اُن کے ہاتھوں بہت تکلیفیں اُٹھا چکے تھے، مگر اُس وقت وہ کھڑے ہو کر میری مشغولیت دیکھتے رہے۔ پھر کہنے لگے "عبد اللہ کی ماں، کیا بس اب روانگی ہے؟" میں نے کہا "ہاں، جب تم لوگوں نے ہمیں بہت ستایا اور ہم پر ظلم کیا، تو اب خدا کی زمین میں کہیں نکل جائیں گے جہاں خدا ہمارے لیے اس مصیبت سے بچنے کی کوئی راہ نکال دے"۔ اس پر عمر نے کہا۔ "اللہ تمہارے ساتھ ہو"۔ اُس وقت میں نے اُن پر وہ رقّت دیکھی جو کبھی نہ دیکھی تھی۔ ہمارے وطن چھوڑنے پر وہ غمگین ہو کر واپس چلے گئے۔ اس کے بعد جب عامرؓ ہمارا مطلوبہ سامان لے کر واپس آئے تو میں نے کہا "عبد اللہ کے ابا، کاش تم اِس وقت عمر کو اور ہمارے حال پر اُن کی رقّت اور رنج کو دیکھتے۔ ابھی ابھی وہ یہاں سے ہو کر گئے ہیں"۔ عامرؓ نے کہا کیا تمہیں اس کے مسلمان ہونے کی اُمید ہو گئی ہے؟ میں نے کہا ہاں۔ انہوں نے کہا جس شخص کو تم نے ابھی دیکھا ہے وہ اُس وقت تک مسلمان نہ ہو گا جب تک خطّاب کا گدھا مسلمان نہ ہو جائے۔

---

[1] اس واقعہ کو ابن سنجر نے بھی اپنی مسند میں نقل کیا ہے۔

ان کے اسلام لانے کا قصہ اِس ذہنی کشمکش نے آخر کار ایک روز اُنہیں اس بات پر آمادہ کر دیا کہ جاکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دیں تاکہ یہ قضیہ ہی ختم ہو جائے جس نے ان کو اُلجھن میں ڈال رکھا ہے۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ وہ تلوار لے کر اسی غرض سے نکلے۔ مگر راستے میں اُن کو حضرت نُعیمؓ بن عبداللہ النحّام مل گئے جو خود انہی کے قبیلے بنی عدی کے اشراف میں سے تھے اور خفیہ طور پر مسلمان ہو چکے تھے[1]۔ انہوں نے پوچھا کدھر کا ارادہ ہے؟ کہنے لگے "میں اِس صابی کو قتل کر دینا چاہتا ہوں جس نے قریش میں تفرقہ ڈال دیا ہے، ہم سب کو احمق ٹھیرایا ہے، ہمارے دین میں عیب نکالا ہے، اور ہمارے معبودوں کی بُرائی کی ہے"۔ نُعیم نے کہا "واللہ، اے عمر، تمہارے نفس نے تمہیں دھوکے میں ڈال دیا ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ محمدؐ کے قتل کے بعد بنی عبدِ مَناف تمہیں زمین پر چلنے پھرنے کے لیے جیتا چھوڑ دیں گے؟ تم ذرا پہلے اپنے گھر والوں کی تو خبر لو"۔ حضرت عمرؓ نے کہا "میرے کون سے گھر والے"؟ نُعیم نے کہا "تمہارے بہنوئی اور چچازاد بھائی سعیدؓ بن زید اور تمہاری بہن فاطمہؓ۔ وہ دونوں مسلمان ہو گئے ہیں اور اُنہوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی اختیار کر لی ہے"۔ حضرت عمرؓ پلٹ کر سیدھے بہن کے ہاں پہنچے۔ وہاں حضرت خبّابؓ بن الارت موجود تھے اور ان کے پاس ایک صحیفہ تھا جس میں سورۂ طٰہٰ لکھی ہوئی تھی۔ وہ حضرت فاطمہؓ کو اس کی تعلیم دے رہے تھے۔ حضرت عمرؓ کی آمد جب محسوس ہوئی تو حضرت خبّابؓ گھر کے ایک حصّہ میں چھپ گئے اور حضرت فاطمہؓ نے صحیفے کو ران کے نیچے دبا لیا۔ لیکن حضرت عمرؓ پہلے ہی دروازے میں سے حضرت خبابؓ کی قرأت سُن چکے تھے۔ انہوں نے اندر پہنچ کر کہا یہ کیسی گنگناہٹ تھی جو ابھی میں نے سُنی ہے؟ حضرت فاطمہؓ اور حضرت سعیدؓ نے کہا کہ تم نے کچھ نہیں سُنا۔ انہوں نے کہا نہیں، میں نے سُنا ہے۔ واللہ مجھے خبر ملی ہے کہ تم دونوں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دین کی پیروی اختیار کر چکے ہو۔ پھر انہوں نے اپنے بہنوئی سعیدؓ کو مارا۔ حضرت فاطمہؓ شوہر کو بچانے کے لیے اُٹھیں تو انہوں نے اُن کو بھی مارا جس سے ان کا سر پھٹ گیا۔

[1] اُسد الغابہ اور اصابہ میں ہے کہ یہ اتنے بااثر اور مقبولِ عام شخص تھے کہ جب انہوں نے ہجرت کا ارادہ کیا تو ان کی قوم نے کہا "تم یہیں رہو اور جس دین کی چاہو پیروی کرو۔ خدا کی قسم تم سے کوئی تعرض نہ کر سکے گا۔ ہم تمہاری حمایت میں اپنی جانیں لڑا دیں گے"۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے قبیلہ (بنی عدی) کی بیواؤں اور یتیموں کی بڑی فیاضی سے مدد کیا کرتے تھے۔

تب دونوں میاں بیوی نے کہا کہ ہاں، ہم مسلمان ہوگئے ہیں اور اللہ کے رسولؐ پر ایمان لے آئے ہیں۔ اب تمہارا جو جی چاہے کرلو۔ حضرت عمرؓ نے جب بہن کا خون بہتے دیکھا تو اپنی اس حرکت پر نادم ہوئے اور اپنی جہالت سے رجوع کیا اور بہن سے کہا وہ صحیفہ مجھے دکھاؤ جسے ابھی ابھی تم لوگ پڑھ رہے تھے۔ دیکھوں تو وہ کیا چیز ہے جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) لائے ہیں۔ حضرت عمر پڑھے لکھے آدمی تھے اس لیے اسے پڑھنا چاہتے تھے۔ ان کی بہن نے کہا ہمیں اندیشہ ہے کہ تم اسے کہیں ضائع نہ کردو۔ انہوں نے کہا اس کا اندیشہ نہ کرو اور اپنے معبودوں کی قسم کھائی کہ پڑھ کر اسے واپس کردیں گے۔ اب ان کی بہن کو کچھ امید بندھی کہ یہ مسلمان ہو جائیں گے۔ انہوں نے کہا کہ بھائی، تم اپنے شرک کی وجہ سے نجس ہو اور اس صحیفے کو صرف پاک آدمی ہی ہاتھ لگا سکتے ہیں۔ اس پر حضرت عمر نے اُٹھ کر غسل کیا اور حضرت فاطمہؓ نے صحیفہ ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ جب انہوں نے سورۂ طٰہٰ کا ابتدائی حصہ پڑھا تو کہنے لگے کیسا عمدہ اور بلند پایہ کلام ہے یہ۔ حضرت خبابؓ بن الارت ان کی یہ بات سنتے ہی باہر نکل آئے اور کہا اے عمر، مجھے امید ہے کہ اللہ نے تم کو اپنے نبی کی دُعا کا مصداق بننے کے لیے چُن لیا ہے۔ میں نے کل ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ خدایا ابوالحکم بن ہشام (ابوجہل) یا عمر بن خطابؓ کے ذریعہ سے اسلام کی تائید فرما۔ پس اے عمر اللہ کی طرف آؤ، اللہ کی طرف آؤ۔ حضرت عمر نے کہا مجھے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس لے چلو تاکہ میں مسلمان ہوجاؤں۔ حضرت خبابؓ نے کہا وہ صفا کے قریب ایک مکان (دارارقم) میں اپنے چند اصحاب کے ساتھ ہیں۔ چنانچہ حضرت عمر تلوار کمر سے باندھے ہوئے حضورؐ اور آپ کے اصحاب کی قیام گاہ پر پہنچے اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ حضورؐ کے اصحاب میں سے ایک صاحب نے اُٹھ کر دروازے کی جھری میں سے جھانکا تو دیکھا کہ عمر تلوار باندھے کھڑے ہیں۔ وہ خوف زدہ ہو کر پلٹے اور حضورؐ کو اس کی خبر دی۔ حضرت حمزہؓ بولے آنے دو، اگر نیک ارادے سے آیا ہے تو ہم بھی نیک معاملہ کریں گے، ورنہ اسی کی تلوار سے اسے ختم کردیں گے۔ حضورؐ نے فرمایا اُسے آنے دو۔ حکم کے مطابق عمل کیا گیا اور حضرت عمرؓ کو اندر آنے کا اذن دے دیا گیا۔ ان کے آتے ہی حضورؐ اُن کی طرف آگے بڑھے، ان کی چادر کو مٹھی میں دبا کر شدت سے کھینچا اور فرمایا، "ابن خطاب تمہیں کیا چیز یہاں لائی ہے؟ واللہ، میں سمجھتا ہوں کہ تم باز نہ آؤ گے جب تک اللہ تم پر کوئی سخت آفت نازل نہ کردے۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا "یارسول اللہ، میں اللہ اور اس کے رسول پر اور رسول کی لائی ہوئی تعلیم پر ایمان لانے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔" اس پر حضورؐ نے زور سے اللہ اکبر فرمایا جس سے مکان کے سب لوگ جان گئے کہ عمرؓ مسلمان ہوگئے ہیں۔ اس سے

مسلمانوں کی بڑی ہمت بندھی کہ حضرت حمزہؓ کے بعد حضرت عمرؓ بھی مسلمان ہو گئے اور اب یہ اہل اسلام کے لیے تقویت کے موجب بنیں گے۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے قبول اسلام کے متعلق یہ اہل مدینہ کے راویوں کا بیان ہے۔ حافظ ابو یعلیٰ نے اسے حضرت انس بن مالک سے روایت کیا ہے۔ اور بزّار نے خود حضرت عمرؓ سے۔

حضرت عمرؓ کا اپنا بیان بزّار، طبرانی، بیہقی، ابن عساکر، ابونعیم اور دارقطنی وغیرہ نے حضرات ابن عباسؓ، انس بن مالکؓ اور اسلم مولیٰ عمر وغیرہم سے خود حضرت عمرؓ کا اپنا بیان بھی اپنے اسلام قبول کرنے کے متعلق نقل کیا ہے جو تفصیلات میں تھوڑے تھوڑے اختلافات کے ساتھ ابن اسحاق کی مذکورۂ بالا روایت سے بڑی حد تک ملتا جلتا ہے۔ البتہ ابونعیم اور ابن عساکر نے حضرت عمرؓ کے بیان کی جو روایت حضرت عبداللہؓ بن عباس سے نقل کی ہے اس میں یہ اضافہ ہے کہ میں نے عرض کیا "یا رسول اللہؐ کیا ہم حق پر نہیں ہیں خواہ جییں یا مریں"؟ آپؐ نے فرمایا "اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تم لوگ حق پر ہو، خواہ جیو یا مرو"۔ میں نے عرض کیا "پھر یا رسول اللہ چھپانے کی کیا ضرورت ہے؟ جب ہم حق پر ہیں اور وہ باطل پر تو ہم اپنا دین کیوں چھپائیں"؟ حضورؐ نے فرمایا "اے عمرؓ، ہم قلیل التعداد ہیں اور تم دیکھ رہے ہو کہ ہم کن حالات سے گذر رہے ہیں"۔ میں نے عرض کیا، "اُس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ نبی بنا کر بھیجا ہے، میں کوئی ایسی مجلس نہ چھوڑوں گا جہاں میں پہلے کفر کے ساتھ بیٹھا تھا اور اب اسلام کے ساتھ نہ بیٹھوں"۔ پھر ہم لوگ دو صفوں میں نکلے۔ ایک میں میں تھا اور دوسرے میں حمزہؓ۔ یہاں تک کہ ہم مسجد حرام میں داخل ہو گئے۔ قریش نے جب ہم کو دیکھا تو اُن کو اس قدر شدید دھچکا لگا کہ پہلے کبھی نہ لگا تھا۔ اِس واقعہ کو ابن ماجہ، حاکم اور ابن سعد نے ذرا مختلف طریقہ سے نقل کیا ہے۔ ابن ہشام نے حضرت عمرؓ کا یہ بیان بھی روایت کیا ہے کہ جس روز میں نے اسلام قبول کیا اسی رات مجھے خیال آیا کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شدید ترین دشمن ہو اس کو مجھے اپنے اسلام کی دعوت دینی چاہیے۔ چنانچہ میں سیدھا ابوجہل کے ہاں گیا اور اس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ نکلا تو مجھے دیکھ کر کہا خوش آمدید، میرے بھانجے، کیسے آئے۔ میں نے کہا میں یہ خبر دینے آیا ہوں کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں۔ اُس نے کہا "بُرا ہو تیرا اور اُس چیز کا جسے تو لے کر آیا ہے"۔ اور دروازہ بند کر لیا۔

ابن عمرؓ کی روایت ابن اسحاق نے نافع کے حوالہ سے حضرت عبداللہؓ بن عمر کی روایت بیان کی ہے کہ اسلام لانے

کے بعد حضرت عمرؓ نے پوچھا قریش میں کون آدمی سب سے زیادہ خبریں پھیلانے والا ہے؟ بتایا گیا کہ جمیل بن مَعْمَر بن حَبِیب الجُمَحِی۔ حضرت عمرؓ اس کی تلاش میں نکلے اور میں بھی ان کے پیچھے چلا۔ اُس وقت میں اس عمر کا لڑکا تھا کہ جو کچھ دیکھتا اُسے سمجھتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے جا کر اس سے کہا کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں اور میں نے دینِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) قبول کر لیا ہے۔ پھر بعد اکہ اُس نے پلٹ کر کوئی بات نہ کی اور اپنی چادر گھسیٹتا ہوا نکل کھڑا ہوا۔ حضرت عمرؓ اس کے پیچھے چلے اور میں ان کے پیچھے۔ جب وہ مسجد حرام کے دروازے پر پہنچا تو بلند آواز سے چیخا "قریش کے لوگو!" سردارانِ قریش اُس وقت کعبہ کے گرد اپنی مجلسوں میں بیٹھے تھے۔ اس کی آواز سن کر سب اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس نے کہا "سنو، عمر دین سے پھر گیا۔" حضرت عمرؓ نے پیچھے سے پکار کر کہا، "جھوٹ کہتا ہے، میں مسلمان ہوا ہوں اور شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں۔" اس پر لوگ اُنہیں مارنے لگے اور وہ بھی لوگوں کو مارنے لگے یہاں تک کہ سورج سر پہ آگیا۔ حضرت عمرؓ تھک کر بیٹھ گئے۔ لوگ اُن کے گرد کھڑے تھے اور حضرت عمرؓ کہہ رہے تھے کہ تمہارا جو جی چاہے کر لو۔ اتنے میں قریش کا ایک شیخ آگے بڑھا اور اُس نے مجمع سے پوچھا کیا معاملہ ہے؟ انہوں نے کہا عمرؓ دین سے پھر گیا ہے۔ اس نے کہا "تو پھر کیا ہوا؟ ایک آدمی نے اپنے لیے جو کچھ چاہا اختیار کر لیا۔ اب تم کیا چاہتے ہو؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ بنی عَدِی اِس طرح اپنے آدمی کو تمہارے حوالے کر دیں گے؟ ہٹ جاؤ اس کے پاس سے۔" اس پر لوگ اس طرح ہٹ گئے جیسے کسی پر سے کپڑا کھینچ لیا جاتا ہے۔ میں نے بعد میں اپنے والد سے پوچھا وہ شخص کون تھا۔ انہوں نے فرمایا "بیٹے، وہ عاص بن وائل سَہمی تھا" (یعنی عمروؓ بن العاص کا باپ)۔ طبرانی اور بزّار نے ابن عمرؓ کی اس روایت کو مختصراً نقل کیا ہے۔

بخاری میں حضرت عبداللہؓ بن عمر کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ اپنے گھر میں خوف زدہ بیٹھے ہوئے تھے تو عاص بن وائل جو جاہلیت کے زمانہ میں ہمارا حلیف تھا، ان کے پاس آیا اور ان سے پوچھا کیوں اس طرح بیٹھے ہو؟ انہوں نے کہا تمہاری قوم مجھے قتل کرنا چاہتی ہے کیونکہ میں مسلمان ہو گیا ہوں۔ اس نے کہا کوئی

سلہ ابن سعد نے حضرت عبداللہؓ بن عمر کا قول نقل کیا ہے کہ میں اس وقت ۶ برس کا تھا اور حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ وہ اس وقت ۵ برس کے تھے۔

تم پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا جبکہ مجھ سے تمہیں امان مل چکی ہے۔ پھر عاص باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ وادی میں آدمیوں کا سیلاب اُمڈا ہوا ہے۔ اس نے پوچھا کیا چاہتے ہو؟ لوگوں نے کہا ہم ابن خطاب کی خبر لینا چاہتے ہیں جو دین سے پھر گیا ہے۔ اس نے کہا کہ عمرؓ پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ اس پر سب واپس چلے گئے۔

اسلام عمرؓ کی تاریخ حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کا واقعہ سنہ بعد بعثت کا ہے جیسا کہ امام نَوَوِی نے تہذیب الاسماء واللغات میں اور مُلّا علی قاری نے اربعینِ نَوَوِی کی شرح میں لکھا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ حضرت حمزہؓ کے تین دن بعد ایمان لائے اور بعض تین ماہ بعد کہتے ہیں۔ مگر ابو نُعیم اصفہانی نے حضرت عبداللہؓ بن عباس کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ میں نے خود حضرت عمرؓ سے ان کے اسلام لانے کا واقعہ پوچھا تو انہوں نے کہا کہ میں حضرت حمزہؓ کے مسلمان ہونے کے تین دن بعد نکلا تھا۔ ابن سعد نے اسے اسلم مولی عمرؓ کے حوالہ سے ذی الحجہ سنہ بعد بعثت کا واقعہ لکھا ہے۔ لیکن غالباً یہ اس سے اچھی خاصی مدت پہلے کا واقعہ ہے۔ سُہَیلی نے لکھا ہے کہ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ۴۰ سے کچھ زیادہ آدمی تھے۔ واحدی نے اس پر دس عورتوں کا اضافہ کیا ہے۔ لیکن حافظ ابن حجرؒ نے مناقب عمرؓ میں ابن ابی خَیثَمہ کے حوالہ سے حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ۳۹ آدمی تھے اور میں نے شامل ہو کر ان کو ۴۰ کر دیا۔ ممکن ہے کہ اس وقت حضرت عمرؓ کو اتنے ہی آدمیوں کا علم ہو، کیونکہ بہت سے مسلمان اپنا ایمان چھپائے ہوئے بھی تھے۔

شِعبِ ابی طالب کی محصوری اس زمانے میں قریش کا غصہ اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف روز بروز زیادہ بھڑکتا چلا جا رہا تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کی ساری کوششوں کے باوجود مکے میں بھی اسلام اندر ہی اندر پھیلتا جا رہا ہے اور بیرونی قبائل کے لوگ بھی پے در پے مسلمان ہو رہے ہیں۔ پھر یہ معاملہ صرف عرب تک ہی محدود نہیں رہ گیا ہے بلکہ حبش تک اس کی جڑیں پھیل گئی ہیں، نجاشی کھلم کھلا مسلمانوں کا حامی بن گیا ہے، اور وہاں سے اسلام قبول کرنے کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وفد آنے لگے ہیں۔ اس پر مزید ان کی آتش غضب کو یہ چیز بھڑکا رہی تھی کہ حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ جیسے بہادر اور بااثر سرداروں کی شمولیت سے اُن مسلمانوں کی ہمتیں بڑھ گئی ہیں جو ہجرتِ حبشہ کے بعد مکہ میں رہ گئے تھے — ابن ابی شَیبہ اور طَبَرانی نے حضرت عبداللہؓ بن مسعود کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "واللہ، ہم بیت اللہ کے گرد نماز نہ پڑھ سکتے تھے جب تک کہ عمرؓ اسلام نہ لے آئے"۔ بخاری میں انہی حضرت ابن مسعودؓ کا یہ قول بھی

منقول ہے کہ ما زلنا اَعِزّۃ منذ اسلم عمر۔ "عمرؓ کے مسلمان ہونے کے بعد ہم برابر زور آور ہی رہے۔"

ان اسباب نے مل جل کر آخر کار قریش کی جاہلیت کو اس قدر برافروختہ کر دیا کہ انہوں نے بالاتفاق ایک دستاویز لکھی جس میں اللہ کی قسم کھا کر یہ عہد کیا گیا تھا کہ جب تک بنی ہاشم اور بنی المطّلب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اُن کے حوالے نہ کر دیں اُس وقت تک اُن سے میل جول، شادی بیاہ، بول چال اور خرید و فروخت کا کوئی تعلق نہ رکھا جائے گا۔ قریش کے تمام خاندانوں کے سربراہوں نے اس دستاویز کی توثیق کی اور اسے خانہ کعبہ میں لٹکا دیا گیا۔ ابن سعد اور ابن البرؒ کا بیان ہے کہ یہ یکم محرم سنہ بعد بعثت کا واقعہ ہے۔

موسیٰ بن عُقبہ نے امام زُہری کے حوالہ سے اپنی مَغازی میں لکھا[1] ہے کہ ابو طالب کو جب معلوم ہوا کہ قریش کے لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کے درپے ہیں تو انہوں نے بنی ہاشم اور بنی المطّلب کو بلایا اور اُن سے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ساتھ لے کر سب کے سب شِعبِ ابی طالب[2] میں جمع ہو جائیں اور آخر وقت تک آپ کی حفاظت کریں۔ اس تجویز کو دونوں خاندانوں نے قبول کیا اور اُن کے کافر اور مسلمان سب شعبِ ابی طالب میں سمٹ آئے۔ اس کے بعد قریش کے باقی خاندانوں نے آپس میں وہ معاہدہ کیا جس کا ذکر اوپر گذرا ہے[3]۔

اس کے برعکس ابن سعد نے واقدی کا اور ابن ہشام نے ابن اسحاق کا بیان نقل کیا ہے کہ پہلے قریش

---

[1] ابن عبدالبرؒ نے سیرت میں اس روایت کو موسیٰ بن عقبہ کے علاوہ محمد بن عبدالرحمٰن ابوالاسود، اور یعقوب بن حمید بن کاسب کے حوالہ سے بھی نقل کیا ہے۔

[2] شِعب کے معنی گھاٹی کے ہیں۔ شعبِ ابی طالب کوہِ ابو قُبیس کی گھاٹیوں میں سے ایک تھی جس میں ابو طالب رہتے تھے۔ اب اس کا نام شِعبِ علی ہے اور اسے سوقُ اللّیل بھی کہا جاتا ہے۔

[3] ابن عبدالبرؒ نے موسیٰ بن عقبہ کے حوالہ سے امام زُہری کی یہ عجیب روایت نقل کی ہے کہ شِعبِ ابی طالب کی محصوری کے بعد حضورؐ نے مکّہ کے مظلوم مسلمانوں کو حبش کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دیا۔ یہ بات معلوم و معروف روایات کے خلاف ہے۔

کے لوگوں نے بنی ہاشم اور بنی المطلب کے مقاطعہ کا عہد نامہ لکھا، اور اس کے بعد یہ دونوں خاندان ابوطالب کی ہدایت پر شعبِ ابی طالب میں محصور ہو کر بیٹھ گئے۔ یہی بات ابن عبدالبر نے بھی سیرت میں لکھی ہے۔ ابولہب اس موقع پر اپنے خاندان سے الگ رہا اور اس نے مقاطعہ کرنے والوں کا ساتھ دیا۔ بنی عبد مناف کے باقی دو خاندان، بنی عبد شمس اور بنی نوفل بھی اپنے ہم جد رشتہ داروں کو چھوڑ کر مقاطعہ کرنے والے دشمنوں کے ساتھ رہے۔

ابن اسحاق کے حوالہ سے ابن ہشام نے محصوری کا زمانہ دو یا تین سال لکھا ہے۔ مگر ابن سعد اور موسیٰ بن عُقبہ نے تعیّن کے ساتھ اس کی مدت تین سال بیان کی ہے۔ اس پورے زمانے میں قریش کا محاصرہ بڑی سختی کے ساتھ جاری رہا۔ محصورین کی ایسی ناکہ بندی کر دی گئی تھی کہ ان کو کھانے پینے کی چیزیں پہنچنے کے تمام راستے بند ہو گئے۔ موسیٰ بن عُقبہ کا بیان ہے کہ باہر کے تاجر اگر مکے آتے تو قریش کے لوگ جلدی کر کے ان کا سب سامان خرید لیتے تاکہ محصورین ان سے کوئی چیز نہ خرید سکیں۔ ابولہب کے متعلق ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ وہ محصورین کو کوئی چیز خریدتے دیکھتا تو پکار کر تاجر سے کہتا کہ ان سے اتنی زیادہ قیمت مانگو کہ یہ خرید نہ سکیں، پھر میں وہی چیز تم سے خرید لوں گا اور تمہارا نقصان نہ ہونے دوں گا۔ ابن سعد اور بیہقی کی روایت ہے کہ محصورین کی حالت یہ ہو گئی تھی کہ ان کے بھوکے بچوں کے رونے بلکنے کی آوازیں شعبِ ابی طالب کے باہر سنی جاتی تھیں۔ یہ لوگ صرف حج کے زمانہ میں نکلتے تھے اور دوسرا حج آنے تک اپنے محلّے میں بند رہتے تھے۔

اس زمانے میں حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے حکیم بن حزام، اور نضلہ بن ہاشم بن عبد مناف کے بھتیجے (یعنی اس کے ماں جائے بھائی کے بیٹے) ہشام بن عمرو العامری، چوری چھپے صلۂ رحمی کا حق ادا کرتے رہے۔ ابن اسحاق کے حوالہ سے ابن ہشام نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ابوجہل نے حکیم بن حزام کو اپنی پھوپھی صاحبہ کے لیے غلّہ لے جاتے ہوئے پکڑ لیا اور کہا "تم بنی ہاشم کے لیے خوراک کا سامان لے جا رہے ہو؟ اچھا، میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا جب تک مکہ بھر میں تمہیں رسوا نہ کر دوں"۔ اتنے میں ابوالبختری بن ہشام، جو بنی اسد بن عبدالعزّیٰ بن قصیّ میں سے تھا اور حضرت خدیجہؓ کا قریبی رشتہ دار ہوتا تھا، وہاں پہنچ گیا اور اس نے پوچھا کیا معاملہ ہے؟ ابوجہل نے کہا یہ بنی ہاشم کے لیے غلّہ لے جا رہا ہے۔ وہ بولا چھوڑ دے اس کو۔ یہ اس کی پھوپھی کا غلّہ ہے جو وہ ان کے پاس لے جا رہا ہے۔ کیا تو ان کی اپنی چیز ان کے پاس نہیں لے جانے دے گا؟ ابوجہل نے انکار کیا۔ اس پر دونوں میں لڑائی ہو گئی اور ابوالبختری نے اسے بُری طرح رگید ڈالا حتیٰ کہ اونٹ کے جبڑے

کی ہڈی اس کے سر پر اس زور سے ماری کہ اس کا سر پھٹ گیا۔ اس سارے معاملے کو حضرت حمزہؓ دیکھ رہے تھے اس لیے دونوں کافروں نے شرما کر اپنا جھگڑا ختم کر دیا تاکہ بنی ہاشم اِس پر خوش نہ ہوں۔ ہشام بن عَمْرو العامِری کے متعلق بھی ابن اسحاق کی روایت ابن ہشام نے نقل کی ہے کہ وہ بھی خفیہ طریقہ سے بنی ہاشم اور بنی المُطَّلِب کے ساتھ صلۂ رحمی کرتا رہتا تھا۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ اونٹ پر غلّہ لاد کر رات کے وقت شِعب ابی طالب کے سرے پر لاتا اور اس کو شعب کے اندر دھکیل دیتا جسے محصورین پکڑ لیتے اور غلّہ اتار کر اونٹ کو واپس چھوڑ دیتے۔ قریش والوں نے اس کو بھی دھمکیاں دیں، مگر ابوسفیان نے کہا چھوڑو اس کو۔ ایک آدمی ہے جو رشتہ داروں سے صلۂ رحمی کر رہا ہے۔

شَقُّ القمر کا واقعہ یہ مقاطعہ پوری شدومد کے ساتھ جاری تھا، مگر جیسا کہ ہم دعوتِ عام کے باب میں بیان کر چکے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اِس کے باوجود علیٰ الاعلان اسلام کی تبلیغ سے ایک دن بھی باز نہ رہے، اور کسی میں یہ جرأت نہ تھی کہ آپ کو اس سے روک دیتا۔ مقاطعے پر ابھی دو ہی برس گزرے تھے کہ شَقُّ القمر کا عظیم الشان واقعہ پیش آگیا، جسے کفارِ مکہ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ محدّثین اور مفسرین کا اِس پر اتفاق ہے کہ یہ ۵ قبلِ ہجرت (یعنی ۸ بعد بعثت) کا واقعہ ہے اور یہ منٰی کے مقام پر پیش آیا تھا۔ خود قرآن مجید میں اس کا ذکر اِس طرح کیا گیا ہے:

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ	قیامت کی گھڑی قریب آگئی اور چاند پھٹ گیا۔
وَإِنْ يَرَوْا آيَةً يُعْرِضُوا وَيَقُولُوا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ۔ (القمر آیت ۱، ۲)	(مگر اِن لوگوں کا حال یہ ہے کہ) یہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں، منہ موڑ جاتے ہیں اور کہتے ہیں یہ تو چلتا ہوا جادو ہے۔

بعض عقلیت پرستوں نے چاند جیسے عظیم کُرے کے پھٹنے کو بعید از امکان سمجھ کر اِنْشَقَّ الْقَمَرُ کا مطلب یہ لیا ہے کہ "چاند پھٹ جائے گا"۔ حالانکہ اگر اس کا ترجمہ "پھٹ گیا" کے بجائے "پھٹ جائے گا" کیا جائے تو دونوں آیتوں کا مطلب خبط ہو جاتا ہے۔ پہلی آیت میں چاند کے پھٹنے کو قیامت کی گھڑی قریب آنے کی علامت بتایا گیا ہے۔ اگر اسے آئندہ ہونے والا واقعہ قرار دیا جائے تو چاند کے پھٹنے کو قیامت کے قریب ہونے کی علامت کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟ پھر یہ معنی لینے کی صورت میں آگے کی آیت تو بالکل ہی بے معنی ہو جاتی ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ لوگ ایسے ہٹ دھرم ہیں کہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں، اس سے منہ موڑ لیتے ہیں اور اسے جادو کا کرشمہ قرار دے دیتے ہیں۔ یہ سیاق و سباق تو اِنْشَقَّ الْقَمَرُ کے یہ معنی قطعی طور پر

منتقین کر دیتا ہے کہ اُس وقت چاند فی الواقع پھٹ گیا تھا۔ اسی معنی کی تصدیق حدیث کی معتبر روایات کرتی ہیں۔
یہ روایات بخاری، مسلم، ترمذی، احمد، ابو عوانہ، ابو داؤد طیالسی، عبد الرزاق، ابن جریر، بیہقی، طبرانی، ابن مردویہ اور ابو نعیم اصفہانی نے بکثرت سندوں کے ساتھ حضرت علیؓ، حضرت عبد اللہؓ بن مسعود، حضرت عبد اللہؓ بن عباس، حضرت عبد اللہؓ بن عمر، حضرت حذیفہؓ بن الیمان، حضرت انسؓ بن مالک اور حضرت جبیرؓ بن مطعم سے نقل کی ہیں۔ ان میں سے تین بزرگ، یعنی حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت حذیفہ اور حضرت جبیر بن مطعم تصریح کرتے ہیں کہ وہ اس واقعہ کے عینی شاہد ہیں۔ اور دو بزرگ ایسے ہیں جو اس کے عینی شاہد تو نہیں ہو سکتے تھے، کیونکہ یہ ان میں سے ایک (یعنی عبد اللہؓ بن عباس) کی پیدائش سے پہلے کا واقعہ ہے، اور دوسرے (یعنی انسؓ بن مالک) اُس وقت بچے تھے، لیکن چونکہ یہ دونوں حضرات صحابی ہیں اس لیے ظاہر ہے کہ انہوں نے ایسے سن رسیدہ صحابیوں سے سن کر ہی اسے روایت کیا ہوگا جو اس واقعہ کا براہ راست علم رکھتے تھے۔

تمام روایات کو جمع کرنے سے اس کی جو تفصیلات معلوم ہوتی ہیں وہ یہ ہیں کہ یہ ہجرت سے تقریباً ۵ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ قمری مہینے کی چودھویں شب تھی۔ چاند ابھی ابھی طلوع ہوا تھا۔ یکایک وہ پھٹا اور اس کا ایک ٹکڑا سامنے کی پہاڑی کے ایک طرف اور دوسرا دوسری طرف نظر آیا۔ یہ کیفیت بس ایک ہی لحظہ رہی اور پھر دونوں ٹکڑے باہم جڑ گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت منیٰ میں تشریف فرما تھے۔ آپ نے لوگوں سے فرمایا دیکھو اور گواہ رہو۔ کفار نے کہا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہم پر جادو کر دیا تھا اس لیے ہماری آنکھوں نے دھوکا کھایا۔ دوسرے لوگ بولے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم پر جادو کر سکتے تھے، تمام لوگوں پر تو نہیں کر سکتے تھے۔ باہر کے لوگوں کو آنے دو۔ ان سے پوچھیں گے کہ یہ واقعہ انہوں نے بھی دیکھا ہے یا نہیں۔ باہر سے جب کچھ لوگ آئے تو انہوں نے شہادت دی کہ وہ بھی یہ منظر دیکھ چکے ہیں۔

بعض روایات جو حضرت انسؓ سے مروی ہیں ان کی بنا پر یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ شق القمر کا واقعہ ایک مرتبہ نہیں بلکہ دو مرتبہ پیش آیا تھا۔ لیکن اوّل تو صحابہ میں سے کسی اور نے یہ بات بیان نہیں کی ہے۔ دوسرے خود حضرت انس کی بھی بعض روایات میں مَرَّتَین (دو مرتبہ) کے الفاظ ہیں اور بعض میں فِرقتَین اور شِقَّتَین (دو ٹکڑے) کے الفاظ۔ تیسرے یہ کہ قرآن مجید صرف ایک انشقاق کا ذکر کرتا ہے۔ اس بنا پر صحیح بات یہی ہے کہ یہ واقعہ صرف ایک مرتبہ پیش آیا تھا۔ رہے وہ قصے جو عوام میں مشہور ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے انگلی سے چاند کی طرف اشارہ کیا اور وہ دو ٹکڑے ہو گیا ، اور یہ کہ چاند کا ایک ٹکڑا حضور کے گریبان میں داخل ہو کر آپ کی آستین سے نکل گیا ، سب بالکل ہی بے اصل ہیں ۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس واقعہ کی حقیقی نوعیت کیا تھی ؟ کیا یہ ایک معجزہ تھا جو کفار مکہ کے مطالبے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رسالت کے ثبوت میں دکھایا تھا ؟ یا یہ ایک حادثہ تھا جو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے چاند میں پیش آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اس کی طرف توجہ صرف اس غرض کے لیے دلائی کہ یہ امکانِ قیامت اور قربِ قیامت کی ایک نشانی ہے ؟ علمائے اسلام کا ایک بڑا گروہ اسے حضور کے معجزات میں شمار کرتا ہے اور ان کا خیال یہ ہے کہ کفار کے مطالبہ پر یہ معجزہ دکھایا گیا تھا ۔ لیکن اس رائے کا مدار صرف بعض اُن روایات پر ہے جو حضرت انس سے مروی ہیں ۔ اُن کے سوا کسی صحابی نے بھی یہ بات بیان نہیں کی ہے ۔ فتح الباری میں ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ " یہ قصہ جتنے طریقوں سے منقول ہوا ہے اُن میں سے کسی میں بھی حضرت انسؓ کی حدیث کے سوا یہ مضمون میری نگاہ سے نہیں گزرا کہ شقّ القمر کا واقعہ مشرکین کے مطالبہ پر ہوا تھا " (باب انشقاق القمر) ۔ ایک روایت ابو نُعیم اصفہانی نے دلائل النبوۃ میں حضرت عبداللہؓ بن عباس سے بھی اسی مضمون کی نقل کی ہے ۔ مگر اس کی سند ضعیف ہے اور قوی سندوں سے جتنی روایات کتب حدیث میں ابن عباسؓ سے منقول ہوئی ہیں ان میں سے کسی میں بھی اس کا ذکر نہیں ہے ۔ علاوہ بریں حضرت انسؓ اور حضرت عبداللہؓ بن عباس ، دونوں اِس واقعہ کے ہم عصر نہیں ہیں ، بخلاف اس کے جو صحابہ اُس زمانے میں موجود تھے ، حضرت عبداللہؓ بن مسعود ، حضرت حُذَیفہؓ ، حضرت جُبَیرؓ بن مُطعِم ، حضرت علیؓ ، حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ ، ان میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا ہے کہ مشرکینِ مکہ نے حضورؐ کی صداقت کے ثبوت میں کسی نشانی کا مطالبہ کیا تھا اور اس پر شق القمر کا یہ معجزہ ان کو دکھایا گیا ۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قرآن مجید خود بھی اس واقعہ کو رسالتِ محمدی کی نہیں بلکہ قربِ قیامت کی نشانی کے طور پر پیش کر رہا ہے ۔ البتہ یہ اس لحاظ سے حضورؐ کی صداقت کا ایک نمایاں ثبوت ضرور تھا کہ آپؐ نے قیامت کے آنے کی جو خبریں لوگوں کو دی تھیں ، یہ واقعہ ان کی تصدیق کر رہا تھا ۔

معترضین اس پر دو طرح کے اعتراضات کرتے ہیں ۔ اوّل تو ان کے نزدیک ایسا ہونا ممکن ہی نہیں ہے کہ چاند جیسے عظیم کُرے کے دو ٹکڑے پھٹ کر الگ ہو جائیں اور سینکڑوں میل کے فاصلے تک ایک دوسرے سے دُور جانے کے بعد پھر باہم جُڑ جائیں ۔ دوسرے ، وہ کہتے ہیں کہ اگر ایسا ہوا ہوتا تو یہ واقعہ دنیا بھر میں

مشہور ہو جاتا، تاریخوں میں اس کا ذکر آتا، اور علم نجوم کی کتابوں میں اسے بیان کیا جاتا۔ لیکن درحقیقت یہ دونوں اعتراضات بے وزن ہیں۔ جہاں تک اس کے امکان کی بحث ہے، قدیم زمانے میں تو شاید وہ چل بھی سکتی تھی، لیکن موجودہ دور میں سیاروں کی ساخت کے متعلق انسان کو جو معلومات حاصل ہوئی ہیں ان کی بنا پر یہ بات بالکل ممکن ہے کہ ایک کرہ اپنے اندر کی آتش فشانی کے باعث پھٹ جائے اور اس زبردست انفجار سے اس کے دو ٹکڑے دور تک چلے جائیں، اور پھر اپنے مرکز کی مقناطیسی قوت کے سبب سے وہ ایک دوسرے کے سامنے آ ملیں۔ رہا دوسرا اعتراض تو وہ اس لیے بے وزن ہے کہ یہ واقعہ اچانک بس ایک لحظہ کے لیے پیش آیا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ اس خاص لمحے میں دنیا بھر کی نگاہیں چاند کی طرف لگی ہوئی ہوں۔ اس سے کوئی دھماکا نہیں ہوا تھا کہ لوگوں کی توجہ اس کی طرف منعطف ہوتی۔ پہلے سے کوئی اطلاع اس کی نہ تھی کہ لوگ اس کے منتظر ہو کر آسمان کی طرف دیکھ رہے ہوتے۔ اور تمام روئے زمین پر اسے دیکھا بھی نہیں جا سکتا تھا، بلکہ عرب اور اس کے مشرقی جانب کے ممالک ہی میں اس وقت چاند نکلا ہوا تھا۔ تاریخ نگاری کا ذوق اور فن بھی اس وقت تک اتنا ترقی یافتہ نہ تھا کہ مشرقی ممالک میں جن لوگوں نے اسے دیکھا ہوتا وہ اسے ثبت کر لیتے اور کسی مؤرخ کے پاس یہ شہادتیں جمع ہوتیں اور وہ تاریخ کی کسی کتاب میں ان کو درج کر لیتا۔ تاہم مالابار کی تاریخوں میں یہ ذکر آیا ہے کہ اس رات وہاں کے ایک راجہ نے یہ منظر دیکھا تھا۔ رہیں علم نجوم کی کتابیں اور جنتریاں، تو ان میں اس کا ذکر آنا صرف اس حالت میں ضروری تھا جبکہ چاند کی رفتار، اور اس کی گردش کے راستے اور اس کے طلوع و غروب کے اوقات میں اس سے کوئی فرق واقع ہوا ہوتا۔ یہ صورت چونکہ پیش نہیں آئی اس لیے قدیم زمانے کے اہل تنجیم کی توجہ اس کی طرف منعطف نہیں ہوئی۔ اس زمانے میں رصدگاہیں اس حد تک ترقی یافتہ نہیں تھیں کہ افلاک میں پیش آنے والے ہر واقعہ کا نوٹس لیتیں اور اس کو ریکارڈ پر محفوظ کر لیتیں۔

(باقی)

بدیع الزمان سعید نورسی کا کردار

عالمگیر جنگِ اوّل میں

از جناب ثروت صولت صاحب

جنگ طرابلس کے وقت سے سلطنت عثمانیہ بیرونی جارحیت کی مسلسل شکار ہو رہی تھی۔ جنگ طرابلس میں ترکوں کے ہاتھ سے پورا لیبیا نکل گیا۔ اس کے بعد ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان شروع ہو گئی جس کے نتیجے میں یورپ میں تقریباً ۵۵ ہزار مربع میل کا علاقہ، جس کی آبادی ۳۲ لاکھ تھی، سلطنت عثمانیہ کے قبضے سے نکل گیا۔[1] ان علاقوں میں آباد لاکھوں ترک یورپی علاقوں سے ہجرت کر کے ترکی آنے پر مجبور ہوئے۔ جنگ بلقان کو ختم ہوئے ابھی مشکل سے ایک سال گذرا تھا کہ اگست ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ شروع میں تو ترکوں نے غیر جانبدار رہنے کی کوشش کی لیکن جرمنی کے حامی گروپ کے دباؤ کے تحت، جس کی قیادت انور پاشا کر رہے تھے، ۳۰ اکتوبر ۱۹۱۴ء کو عثمانی سلطنت کو بھی جرمنوں کے حلیف کی حیثیت سے جنگ میں شامل ہونا پڑا۔

جنگ عظیم کے دوران ترکوں کو چار محاذوں پر لڑنا پڑا یعنی درہ[1] دانیال یا گیلی پولی، جزیرہ نمائے سینا[2]، عراق[3] اور قفقاز[4]۔ ترکوں کو سب سے زیادہ خطرہ روس کی طرف سے تھا، جس کی سرحدیں مشرقی ترکی سے ملتی تھیں۔ مشرقی ترکی اور قفقاز کا یہی محاذ تھا جہاں ترکوں کو جنگِ عظیم کی خونریز ترین لڑائیاں لڑنی پڑیں اور جن کے دوران لاکھوں ترک شہید ہو گئے اور مشرقی ترکی کا ایک بڑا حصہ تباہ و برباد ہو گیا۔ صرف سری کمش (SARIKAMIS) کے معرکوں میں جنوری ۱۹۱۵ء میں ساٹھ ہزار ترک فوجی جنگ کرتے ہوئے یا برف میں شدتِ سرما سے اکڑ کر شہید ہو گئے، تیس ہزار ترک زخمی ہو گئے اور سات ہزار قید۔

[1] محمد عزیز، دولت عثمانیہ حصہ دوم ص ۳۲۵ - دار المصنفین، اعظم گڈھ ۱۹۴۳ء۔

ان کے علاوہ صوبہ قرص (KARS) اور نواحی علاقوں میں چالیس ہزار مسلمان بوڑھے، بچے اور عورتیں روسیوں کے قتلِ عام میں کام آئے۔[1] سری کمش کی جنگ کے ایک سال بعد روسی فوجیں گرانڈ ڈیوک نکولس کی قیادت میں مشرقی ترکی میں داخل ہونے میں کامیاب ہوگئیں۔ روسی فوجیں جن کی تعداد ترکوں کے مقابلے میں تین گنی زیادہ تھی پسینلر (PASINLER) کی جنگ میں ترکوں کو شکست دے کر ۱۶ ار فروری ۱۹۱۶ء کو ارض روم کے شہر میں داخل ہوگئیں۔

استاد بدیع الزمان سعید نورسی جنگ کے آغاز ہی میں وان (VAN) میں موجود تھے، جو قفقاز کے محاذ سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ رُوسی حملے کے فوراً بعد انہوں نے اپنی خدمات بحیثیت ایک رضاکار پیش کر دیں۔ ان کو رضاکاروں کے ایک دستہ کا جو اُن کے اپنے طلبہ اور شاگردوں پر مشتمل تھا، کمانڈر بنا دیا گیا۔ جنگ کے دوران سعید نورسی نے جس حیرت انگیز جرأت، جنگی مہارت، بہادری اور اخلاقی کردار کا مظاہرہ کیا اس کی مثال علماء کی زندگیوں میں کم ملے گی۔ انہوں نے اس جنگ میں ثابت کر دیا کہ وہ صرف صاحبِ قلم ہی نہیں بلکہ صاحبِ سیف بھی ہیں اور یہ کہ مسجد کا منبر اور گھوڑے کی پیٹھ ان کے لیے برابر ہے۔

وان پر جب رُوسیوں نے حملہ کیا تو استاد نے اپنے مدرسے کی قلعہ بندی کر لی تاکہ وہ آخر وقت تک مقابلہ جاری رکھیں یہاں تک کہ جان دے دیں۔ لیکن وان کے والی جودت بے کے شدید اصرار پر ان کو وان خالی کر کے قصبہ وستان (VASTAN) کی طرف پسپائی اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس کے بعد جب روس کے کاسک سواروں کے ایک دستے نے وستان پر بھی حملہ کر دیا تو استاد سعید نورسی نے اپنے رضاکاروں کو لے کر اور تیس چالیس فوجیوں کی مدد سے جو وہاں موجود تھے کاسکوں کا مقابلہ کیا اور انخلاء کر دینے والے لوگوں کے مال و جائیداد اور بچوں کی حفاظت کی۔ وہ رات کے وقت کاسکوں کے اُونچے ٹیلے پر بار بار چھاپے مارتے تھے اور اس طرح وہ روسیوں پر ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ وستان کی حفاظت کے لیے ایک بڑی فوج موجود ہے اور یہ کہ اس کو برابر کمک پہنچ رہی ہے۔ اُن کی اس تدبیر سے وستان روسیوں کے قبضے میں جانے سے بچ گیا۔

اس دوران میں روسی فوج کے تین دستوں نے وان اور موش پر قبضہ کرنے کے بعد تبلیس (BITLIS)

---

[1] کمال لذکی گنج عثمان: ترک داستانلری ص ۲۰۰ (حریت یاینلری، استنبول ۱۹۷۲ء)

پر حملہ کر دیا۔ بتلیس کے والی ممدوح بے اور کمانڈر کیل علی نے اس موقع پر استاد بدیع الزمان سے مشورہ کیا اور بتایا کہ ہمارے پاس چونکہ صرف ایک بٹالین فوج اور دو ہزار رضاکار ہیں اس لیے ہم پسپا ہونے پر مجبور ہیں۔ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے۔ استاد نے جواب دیا:

"ایسی صورت میں اطراف سے آکر پناہ لینے والے اور بتلیس کے لوگوں کا مال اور جائیداد عورتیں اور بچے دشمنوں کے قبضے میں چلے جائیں گے۔ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم کم از کم پانچ دن تک دشمن کو اور روکے رکھیں تاکہ لوگوں کو بستی سے نکالا جاسکے۔"

والی نے اس پر کہا کہ:

"موش کے سقوط کے بعد وہاں کی تیس توپیں ہمارے فوجی اس طرف لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر آپ ان رضاکاروں کی مدد سے ان توپوں کو ہمارے پاس پہنچا دیں تو پھر ہم ان توپوں کی مدد سے چند دن اور دشمن کا مقابلہ کرسکیں گے۔"

استاد بدیع الزمان نے وعدہ کیا کہ وہ ان توپوں کو لانے کی پوری کوشش کریں گے۔ وہ یا تو ان توپوں کو لے آئیں گے یا اپنی جان دے دیں گے۔ چنانچہ استاد تین سو رضاکار طلبہ کو لے کر توپوں کو بچا کر لانے والے فوجیوں کی مدد کے لیے دوڑ پڑے۔ انہوں نے اس موقع پر بھی تدبیر سے کام لیا اور روسیوں کو خوفزدہ کرنے کے لیے اپنے جاسوسوں کے ذریعے طرح طرح کی خبریں پھیلانی شروع کر دیں۔ مثلاً انہوں نے ایک خبر یہ پھیلائی کہ بتلیس کا دفاع کرنے والے رضاکاروں کا کمانڈر تین ہزار فدائیوں کے ساتھ اور پہاڑی علاقے کا ایک سردار موسٰی بے ایک ہزار افراد کے ساتھ توپوں کو بچانے کے لیے آرہا ہے۔

اس قسم کی خبروں کے عام ہو جانے کے بعد کاسکوں کا کمانڈر ڈر گیا اور آگے نہیں بڑھا۔ استاد نے اس دوران رضاکاروں کی مدد سے ایک ایک دو دو توپیں بتلیس روانہ کرنا شروع کر دیں اور اس طرح تمام توپوں کو دشمن کے ہاتھ میں جانے سے بچا لیا۔ ان تیس توپوں کی مدد سے فوجی اور رضاکار تین چار دن تک بتلیس کا دفاع کرتے رہے اور اس دوران میں شہر کے باشندوں نے اپنے مال و دولت کو ساتھ لے کر شہر خالی کر دیا۔

استاد سعید نورسی لوگوں کی طرف سے شہر خالی کر دینے کے بعد بھی بتلیس میں مقیم رہے۔ کیونکہ شہر میں اب بھی بہت سے لوگ ایسے رہ گئے تھے جو شہر خالی نہیں کر سکتے تھے۔ استاد یہ گوارا نہیں کر سکتے

تھے کہ ان کو دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں۔ وہ جاں نثار طلبہ کی ایک تعداد کے ساتھ بتلیس میں رہ گئے اور خود کو فدا کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ شہر رات ہی کو خالی کر دیا گیا تھا۔ صبح جب دشمن شہر میں داخل ہوا تو استاد کے رضاکاروں سے اس کا تصادم ہو گیا جس میں استاد کے بیشتر ساتھی شہید ہو گئے۔ ان کا بھتیجہ عُبید بھی جو ایک دلیر طالب علم تھا شہید ہو گیا۔ استاد نے زندہ بچ جانے والے تین طلبہ کے ساتھ دشمنوں کی صفوں میں سے گذر کر نکل جانے کی کوشش کی۔ لیکن روسی فوجیں تمام راستوں پر قابض تھیں۔ استاد نے ایک نہر کے اندر سے گزرنے کی کوشش کی اور اس مقصد کے لیے ایک بلند جگہ سے نہر میں چھلانگ لگادی، لیکن رات کا وقت تھا صحیح اندازہ نہ ہو سکا اور وہ نہر کے کنارے ایک چٹان پر آ گرے جس سے ان کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی۔ قریب ہی ایک مکان کی اُوپر کی منزل میں رُوسی فوجی موجود تھے اور نیچے استاد پانی اور کیچڑ میں بندوق سنبھالے اپنے ساتھیوں کے حوصلے بڑھا رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے:

"ہم صرف اس وقت گولی چلائیں گے جب دشمن بڑی تعداد میں آئے گا۔ ہم کو پکڑنے کے لیے اس کو بڑی قیمت ادا کرنی پڑے گی، اس کو ہم اپنی تلواروں پر رکھ لیں گے"۔

استاد سعید نورسی تینتیس ۳۳ گھنٹے تک اسی طرح پانی اور کیچڑ میں بیٹھے رہے۔ وہ روسیوں کو دیکھ رہے تھے لیکن روسی ان کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ استاد نے کوشش کی کہ کم از کم ان کے ساتھی کسی طرح اپنی جان بچالیں اس لیے انہوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا:

"بھائیو! آپ اب یہاں نہ ٹھہریے، مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دیجیے اور آپ لوگ خاموشی سے کھسک جائیے"۔

لیکن ایسے جاں نثار استاد کے شاگرد بزدل نہیں ہو سکتے تھے۔ انہوں نے اس پیش کش کو قبول نہیں کیا اور کہا:

"ہم شہید ہو جائیں گے اور آپ پر اپنی جانیں فدا کر دیں گے، لیکن آپ کو اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جائیں گے"۔

اب زیادہ دیر روپوش رہنا ممکن نہیں رہا۔ استاد اور ان کے ساتھیوں نے جب نکلنے کی کوشش کی تو روسیوں کے ایک دستے نے جو پچاس سپاہیوں پر مشتمل تھا، ان کو گھیر کر گرفتار کر لیا۔

مشہور ترک مصنف اور صحافی اشرف ادیب لکھتے ہیں کہ ارمنی اپنی جان نثاری میں مشہور تھے۔ ان کے بارے

میں کہا جاتا تھا کہ ارمنی فدائیوں کے بھیس سے جلا دو، ان کو آگ پر کھڑا کر دو، ان کی آنکھیں پھوڑ دو لیکن وہ اپنا راز پھر بھی نہیں بتائیں گے ۔ لیکن روسیوں کا کہنا تھا کہ ملا سعید کے رضاکار، ارمنی فدائیوں سے بھی بازی لے گئے ۔

جہاں تک استاد سعید نورسی کی جرأت اور بے جگری کا تعلق ہے، ان کا یہ حال تھا کہ جنگ کے دوران وہ خندق میں پناہ نہیں لیتے تھے ۔ وہ رضاکاروں کا حوصلہ بڑھانے کے لیے خندق کے سامنے، دشمن کی زد میں بے خوفی کے ساتھ پھرتے رہتے تھے ۔ چار مرتبہ ایسا ہوا کہ گولے ان کے پاس گرے ۔ لیکن اس کے باوجود نہ وہ پیچھے ہٹتے تھے اور نہ خندق میں جاتے تھے ۔ بتلیس کے والی ممدوح بے اور کمانڈر کیل علی کو جب اس کی خبر ہوئی تو انہوں نے استاد کے پاس پیغام بھجوایا کہ وہ پیچھے آ جائیں، لیکن استاد نے صاف انکار کر دیا اور کہلوا دیا کہ آپ پریشان نہ ہوں ۔ ان کافروں کی گولیوں سے میں نہیں مر سکتا ۔ حالانکہ گولوں کے ٹکڑوں سے وہ زخمی بھی ہو گئے تھے ۔ ایک ٹکڑا ان کے تمباکو کے ڈبے میں لگا اور دوسرا گلے میں ۔

ارمنی عورتوں اور بچوں کا تحفظ

جنگ کے دوران استاد سعید نورسی نے جہاں دشمنوں سے اپنی بہادری کا لوہا منوایا وہاں انہوں نے اپنے کردار کی بلندی کی دھاک بھی بٹھا دی ۔ ان کے کردار کی اس بلندی کا سب سے بڑا ثبوت ان کا وہ طرز عمل ہے جو انہوں نے مشرقی ترکی میں آباد ارمنی عیسائی باشندوں کے ساتھ اختیار کیا ۔ ارمنی اور ترک باشندوں میں عہد قدیم سے دشمنی[1] چلی آ رہی ہے ۔ عہد قدیم میں مشرقی ترکی عظیم آرمینیہ کا ایک حصہ تھا اور پہلی جنگ عظیم تک مشرقی ترکی کے کئی صوبوں میں ارمنی نسل کے باشندے بڑی تعداد میں موجود تھے ۔ اگرچہ اکثریت ان کو ایک بھی صوبے میں حاصل نہ تھی ۔ جنگ عظیم چھڑ جانے کے بعد جب روسی

---

[1] ترکی میں آباد ارمنی باشندوں کا مسئلہ موجودہ جمہوریت کے قیام سے پہلے تک سلطنت عثمانیہ کا ایک اہم مسئلہ رہا ہے اور اس پر ترکی زبان میں بہت لکھا گیا ہے ۔ اس موضوع پر ذیل کی کتابیں قابل مطالعہ ہیں:

1- SADI KOÇAŞ: TARIH BOYUNCA ERMENILER VE TÜRKERMENI ILIŞKILERI (سعدی کوچاش: ارمنیوں کی تاریخ اور ترکوں اور ارمنوں کے تعلقات) انقرہ ۱۹۶۷ء ۔

2- ABDULLAH YAMAN: ERMENI MESELESI VE TÜRKIYE (عبداللہ یامان: ارمنی مسئلہ اور ترکی) استنبول ۱۹۷۳ء ۔

نے ترکی پر حملہ کر دیا تو روسی آرمینیہ کے باشندوں کو عظیم تر آرمینیہ کے خواب کی تعبیر حاصل کرنے کا سنہرا موقع ہاتھ آ گیا۔ اس موقع پر ترکی کے ارمنی باشندوں نے بھی روسی فوجوں کا خیر مقدم کیا اور ان کے تعاون سے مقبوضہ علاقوں کے ترکوں کا قتل عام شروع کر دیا، تاکہ ترکوں کو اقلیت میں تبدیل کر کے ترکی علاقوں کو عظیم تر آرمینیہ میں شامل کر لیا جائے۔ ارمنی اس قتل عام کے دوران ترک عورتوں اور بچوں تک پر رحم نہیں کھاتے تھے اور ان کو بے دریغ قتل کر دیتے تھے۔ اس کے جواب میں بعض اوقات ترک بھی ارمنوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتے تھے۔

استاد بدیع الزمان سعید نورسی کا یہ عظیم کارنامہ ہے جو انسانیت کی تاریخ میں ہمیشہ زریں حروف سے لکھا جائے گا کہ انہوں نے اپنے زیر اثر علاقوں میں پوری قوت سے مسلمانوں کو عورتوں اور بچوں کے قتل سے روکا۔ اس زمانے میں ترکی میں ارمنی باشندے سب سے زیادہ صوبہ بتلیس میں آباد تھے جہاں ان کا تناسب ۳۳ فیصد یا ایک تہائی تھا۔ اس کے بعد وہ سب سے زیادہ ارض روم میں تھے یعنی ۲۰ فیصد اور پھر وان میں تھے جہاں ان کا تناسب ۱۹ فیصد تھا[1]۔

استاد بدیع الزمان نے ترک فوجیوں اور مسلمانوں کو سمجھایا کہ شرعاً عورتوں اور بچوں کا قتل جائز نہیں ہے۔ استاد نے نہ صرف ارمنی عورتوں اور بچوں کی جانیں بچائیں بلکہ ان کو ہزاروں کی تعداد میں حفاظت کے ساتھ روسی علاقے میں موجود ارمنوں کے پاس پہنچا دیا۔ استاد سعید نورسی کا یہ وہ اعلیٰ کردار تھا جس سے ارمنی باشندے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ چنانچہ انہوں نے بھی مسلمان عورتوں اور بچوں کو قتل کرنا بند کر دیا۔ وہ کہتے تھے کہ چونکہ ملا سعید نے ہماری عورتوں اور بچوں کو قتل نہیں کیا اس لیے ہم بھی آئندہ مسلمان بچوں کو قتل نہیں کریں گے۔

اس طرح استاد بدیع الزمان سعید نورسی کی کوششوں اور اسلامی احکام پر ان کے عمل کرنے سے ہزاروں معصوموں اور بے گناہوں کی زندگیاں بچ گئیں۔

اس جگہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ جنگ اور تباہی کے اس ماحول میں بھی استاد درس و تدریس اور وعظ و نصیحت اور تصنیف و تالیف کی طرف سے غافل نہیں رہے۔ وہ جب تک وان میں رہے اپنے مدرسہ میں

---

[1] سعدی کوچاش: ارمنوں کی تاریخ اور ترکوں اور ارمنوں کے تعلقات (ترکی زبان) ص ۲۵۵۔

درس دیتے رہے اور جب وہاں سے نکلے تو بھی اس سلسلے کو جاری رکھا۔ حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ انہوں نے اپنی ایک بہترین کتاب "اشارۃ الاعجاز" جو قرآن حکیم کی تفسیر ہے اسی جنگ کے زمانے میں تالیف کی۔ وہ یہ تفسیر اپنے ایک جاں نثار رفیق کاتب ملا حبیب کو املا کرواتے رہتے تھے جو کردستان کے مقام پہ داد شجاعت دیتے ہوئے شہید ہو گئے۔ یہ تفسیر اس طرح لکھی گئی کہ استاد کبھی گھوڑے کی پیٹھ پہ ہوتے تھے، کبھی خندق میں اور کبھی محاذ جنگ پر۔

استاد بدیع الزمان سعید نورسی کی جنگی خدمات کا عثمانی حکومت نے سرکاری طور پہ اعتراف کیا۔ پَسِنلر کے محاذ پہ انہوں نے جو خدمات انجام دیں ان کا اعتراف خود انور پاشا نے کیا۔ صالح ییشل (YESIL) نے جو امن روم سے عثمانی پارلیمنٹ کے ممبر تھے، وزیر داخلہ کو ایک خط کے ذریعے بتایا کہ استاد نے ان لڑائیوں میں کس دلیری سے جنگ کی۔ انہوں نے خط میں یہ بھی لکھا کہ قفقاز کے برفانی پہاڑوں میں جنگ کرنے پہ استاد کو ایک تمغہ بھی دیا گیا۔

روس کے نظر بندی کیمپ میں

استاد بدیع الزمان اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کرنے کے بعد روسی ان کو ایک عمارت میں لے گئے جہاں دوسری روسی فوج کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ وہاں ان کی ٹانگ پہ پلستر چڑھایا گیا اور دو ہفتے تک ان سے طرح طرح کے سوال وجواب کیے گئے۔ روسیوں کے سوالوں کے جواب وہ اس سختی سے دیتے تھے کہ ان کے ساتھی خوفزدہ ہو جاتے تھے اور یہ سمجھنے لگتے تھے کہ اب ان کو گولی مار دی جائے گی۔ ستائیسویں دن استاد کو ایک دوسری عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔ اس کے بعد ان کے ساتھی روس بھیج دیے گئے لیکن استاد کو ٹانگ کی وجہ سے کچھ دن وہیں رکھا۔ صحت یاب ہونے کے بعد استاد کو بھی براہ وان اور خوئی (ایران) اور اس کے بعد بذریعہ ریل جلفا، طفلیس اور کول گریو (KOLGRIF) کے راستے شمالی روس کے شہر کوسترما [1] (KOSTROMA) پہنچا دیا گیا جہاں قیدیوں کا سب سے بڑا کیمپ واقع تھا۔ اس کیمپ میں ان کے ساتھ نوے ہزار دوسرے ترک قیدی بھی نظر بند تھے۔

کوسترما کے اس کیمپ میں ایک دن روسی کمانڈر قیدیوں کا معائنہ کرنے کے لیے آیا۔ اسے دیکھ کر

[1] غالباً یہ وہی شہر ہے جو روس کے نقشے میں ماسکو کے شمال مشرق اور گورکی کے شمال مغرب میں وولگا کے کنارے کوسترما کے نام سے نظر آتا ہے اور جس کی آبادی اس وقت دو لاکھ سے زیادہ ہے۔

تمام قیدی کھڑے ہو گئے۔ مگر استاد نے کھڑا ہونا تو بڑی بات ہے اس کی طرف نگاہ تک نہیں اُٹھائی۔ کمانڈر کو یہ بات ناگوار گزری۔ وہ یہ خیال کر کے کہ شاید استاد نے اس کو پہچانا نہیں دوبارہ ان کے سامنے سے گزرا۔ لیکن استاد پھر بھی کھڑے نہیں ہوئے۔ کمانڈر نے ترجمان کے توسط سے استاد سے پوچھا کہ کیا تم نے مجھے نہیں پہچانا؟ استاد نے جواب دیا ہاں میں پہچانتا ہوں۔ آپ نکولا نکولادچ ہیں۔ کمانڈر نے کہا اگر ایسا ہے تو تم نے روسی فوج اور زار روس کی توہین کی ہے۔ استاد نے جواب دیا کہ نہیں میں نے توہین نہیں کی ہے۔ میں ایک عالم دین ہوں اور ایک صاحب ایمان شخص اُس شخص سے برتر ہوتا ہے جو اللہ کو نہیں پہچانتا۔ اس وجہ سے میں تمہارے احترام میں نہیں کھڑا ہوا۔

بہرحال استاد کو اس گستاخی کی پاداش میں کورٹ مارشل کے سپرد کر دیا گیا۔ استاد کے بہی خواہوں نے استاد کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ کوئی عذر پیش کر دیں تاکہ وہ کسی سنگین خطرے سے بچ جائیں لیکن استاد نے نہیں مانا اور کہا:

"ان کی سزائے موت کا فیصلہ میرے لیے ابدی عالم کی سیاحت کرنے کے لیے ایک پاسپورٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔"

آخر کار فوجی عدالت نے سزائے موت کا فیصلہ دیا۔ استاد نے سزا پہ عمل ہونے سے پہلے نماز پڑھنے کی اجازت چاہی۔ جب انہوں نے نماز پڑھ لی تو اعلان کیا گیا کہ اب وہ گولی کھانے کے لیے تیار ہو جائیں۔ لیکن ٹھیک اس موقع پہ وہی کمانڈر آگے بڑھا اور آپ سے معافی مانگتے ہوئے کہا:

"میں آپ کے اُس دین کا احترام کرتا ہوں جس نے آپ کو اس حد تک خود دار بنا دیا ہے۔"

اس کے بعد کمانڈر نے سزائے موت کا فیصلہ واپس لے لیا۔

استاد سعید نورسی نظر بندی کے زمانے میں بھی بے کار نہیں رہے۔ وہ اُن نوّے[9] قیدیوں کو جوان کے ساتھ نظر بند تھے باقاعدگی سے درس دیتے تھے۔ روسی کمانڈر نے یہ سمجھ کر کہ یہ سیاسی درس ہے، درس دینے سے روک دیا۔ لیکن جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ دینی درس ہے تو اجازت دے دی۔

سعید نورسی نے اپنی کتاب لمعلر (لمعات) کی تیرھویں رجا (دُعا) میں اپنی اس نظر بندی کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ہمارے کیمپ کے پاس جو دریائے والگا کے کنارے تھا تاتاریوں کی ایک مسجد تھی۔ میں کیمپ میں

ساتھیوں کی موجودگی کے باوجود اُکتا گیا تھا اور تنہائی کا خواہش مند تھا۔ لیکن اجازت کے بغیر کیمپ نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ بعد میں تاتاریوں نے میری ذمہ داری قبول کر لی اور اپنی مسجد میں منتقل کر لیا۔ اب میں تنہا رہنے لگا۔ لیکن شمالِ بعید کی راتیں بہت لمبی ہوتی تھیں۔ موسم بہار ابھی آیا نہیں تھا۔ میں بیشتر راتوں میں جاگتا رہتا تھا۔ رات کی تاریکی میں ہوا کی افسردہ کن سنسناہٹ، بارش کی طویل اور اُداس بوندوں کی ٹپا ٹپ اور دریائے والگا کے پانی کی وحشت ناک آواز مجھے سونے نہیں دیتی تھی۔ میں نے کبھی خود کو اتنا بوڑھا محسوس نہیں کیا جتنا اس وقت محسوس کرنے لگا تھا۔ میری عمر صرف چالیس سال تھی لیکن میں خود کو اسی سالہ بوڑھا محسوس کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ عالمی جنگ سے واپس آنے والا انسان بوڑھا ہو کر واپس آتا ہے۔ پھر طویل راتوں کی تاریکی اور وطن کی یاد نے مجھے مایوسی کا شکار کر دیا۔ میں اپنی تنہائی پر غور کرتا رہتا تھا۔ یہ حالات تھے کہ قرآن مجید میری مدد کو آیا اور زبان اس آیت کو دہرانے لگی:

حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ

اور دل سے دعا نکلی:

غریبم بیکسم ضعیفم ناتوانم
الاماں گویم، عفو جویم، مدد خواہم زدرگاہت الٰہی[1]

اللہ نے ان کی دعا جلد ہی سن لی اور استاد دعا کے چند روز بعد ہی معجزانہ طور پر کیمپ سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہوا یہ کہ اکتوبر ۱۹۱۷ء میں روس میں اشتراکی انقلاب آگیا اور اس کے نتیجے میں جو ہنگامے شروع ہوئے استاد سعید نورسی ان سے فائدہ اٹھا کر کیمپ سے فرار ہو گئے۔ پہلے وہ لینن گراڈ پہنچے جو اس وقت سینٹ پیٹرس برگ کہلاتا تھا اور جہاں بقول اُن کے گرمیوں کی راتیں دن کی طرح روشن تھیں۔ یہاں سے وہ جرمنی کی سرحد پر پہنچے اور جرمن فوجیوں سے اپنا تعارف کرایا۔ ان فوجیوں کو جب معلوم ہوا کہ استاد سعید نورسی ایک ترک فوجی افسر ہیں اور قید سے فرار ہو کر آئے ہیں تو انہوں نے

[1] میں غریب اور بیکس ہوں، ضعیف اور ناتواں ہوں۔ اے اللہ میں تیری درگاہ سے اماں چاہتا ہوں، تجھ سے معافی مانگتا ہوں اور تیری مدد کا خواستگار ہوں۔

ان کو سلامی دی اور اپنے کمانڈر کے پاس لے گئے جس نے استاد کا ادب اور احترام کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ اس کے بعد استاد وارسا اور ویانا کے راستے آسانی سے ۱۳۳۶ھ / ۱۹۱۸ء میں استنبول پہنچ گئے۔

استاد کہتے ہیں کہ میں نے یہ طویل سفر اللہ کی عنایت سے طے کیا۔ کیونکہ میں روسی نہیں جانتا تھا اور سفر اتنا طویل تھا کہ اگر اس کو پیدل طے کیا جاتا تو روسی جاننے والے کے لیے بھی مشکل پیش آتی اور ایک سال صرف ہو جاتا۔ لیکن اللہ کی عنایت سے میں نے یہ سفر آسانی سے طے کر لیا[1]۔

استاد نے روس کی قید میں ڈھائی سال گزارے۔

---

[1] نجم الدین ساہینر: بدیع الزمان سعید نورسی کی زندگی کے نامعروف پہلو
NECMEDDIN SAHINER: BILINMIYEN TARAFLARIYLA BEDUZZAMAN)
(SAID NURSI (TAKIHCEI HAYAT بحوالہ ماہنامہ نور (انگریزی) جنوری ۱۹۸۶ء نیز تاریخچہ حیات
مرتبہ سعید اوزدمیر و تحسین تولا اور سعید نورسی کی کتاب لمعلر۔

رسائل و مسائل

پاکستان کے اسلامی ریاست نہ بننے کی ذمہ داری کس پر ہے؟

سوال :- ہفت روزہ "طاہر" میں اور اس کے بعد نوائے وقت میں جناب کے حوالہ سے مسلم لیگی قیادت کے لیے لفظ فراڈ استعمال کیا گیا ہے۔ میں ایک مسلم لیگی ہوں اور سمجھتا ہوں کہ مسلم لیگ نے قائداعظمؒ کی آنکھیں بند ہوتے ہی ہماؤں سے بڑی بڑی غلطیاں کی ہیں۔ لیکن جناب قائداعظمؒ کے متعلق میرا ایمان و ایقان ہے کہ اگر حیات ان سے وفا کرتی تو وہ اس مملکت خداداد میں اسلامی آئین کے نفاذ کے لیے مقدور بھر مزد رسعی فرماتے۔ میرا خیال ہے کہ تقریر کرتے وقت آپ نے جس مسلم لیگی قیادت کو فراڈ کے خطاب سے نوازا۔ یہ وہ مسلم لیگ تھی جو قائداعظمؒ کے مسلم لیگ کی صدارت سے مستعفی ہونے کے بعد چوہدری خلیق الزمان اور لیاقت علی کی قیادت میں ابھری۔ یقیناً جناب کا منشاء قائداعظم کی ذات ستودہ صفات سے نہیں ہوگا۔

نوائے وقت میں جو افسوسناک بحث چل نکلی ہے، جناب کی طرف سے خاموشی اس کو مزید تقویت دے رہی ہے۔ جناب کی معمولی سی تردید، اس آڑے وقت میں جبکہ ملت کو نوائے وقت کی رہنمائی اور جناب کی قیادت کی اشد ضرورت ہے، ختم کرنے میں ایک مجاہدانہ کردار ادا کرے گی۔

جواب :- وکلاء کے کنونشن میں جو تقریر میں نے کی تھی اس کے بارے میں ایک بات تو صریحاً خلاف واقعہ بیان کی گئی ہے، اور وہ یہ کہ میری تقریر کنونشن کے پہلے دن کی آخری تقریر تھی اور اس کی تردید میاں طفیل محمد صاحب کو دوسرے دن کی کارروائی کے عین آغاز میں کرنی پڑی۔ حالانکہ میری تقریر کنونشن کے دوسرے دن کی کارروائی میں آخری تقریر تھی جس کے بعد سرے سے کوئی اور تقریر ہوئی ہی نہیں —— اس لیے اس بات کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میاں طفیل صاحب نے میری تقریر کی تردید میں کچھ کہا ہو۔ دوسری ایک زیادتی جو میرے ساتھ پہلے بھی اکثر کی جاتی رہی ہے اور اب بھی کی گئی ہے وہ

یہ ہے کہ جب کبھی میں پاکستان میں اسلامی نظام کے نافذ نہ ہونے کی ذمہ داری اُن لوگوں پر ڈالتا ہوں جن کے ہاتھ میں تقسیم کے بعد یہ ملک آیا، تو فوراً قائد اعظم مرحوم کو سامنے لاکھڑا کیا جاتا ہے اور الزام لگایا جاتا ہے کہ میں نے دراصل یہ ذمہ داری اُن پر ڈالی ہے اور میرا یہ حملہ دراصل اُن کی نیت پر ہے۔ حالانکہ میں نے اس سلسلے میں کبھی مرحوم کا نام نہیں لیا۔ "ظاہر" میں میری تقریر کا جو خلاصہ شائع ہوا ہے اُسے پھر پڑھ کر دیکھ لیا جائے۔ اس میں کہاں یہ کہا گیا ہے کہ ملک حاصل ہونے کے بعد اسلامی نظام قائم نہ ہونے کے ذمہ دار قائد اعظم تھے یا یہ کہ اس معاملہ میں وہ مخلص نہ تھے؟

اور بات صرف یہی نہیں ہے کہ میں نے قائد اعظم مرحوم کے متعلق یہ بات کبھی نہیں کہی بلکہ اس کے برعکس ۱۹۵۳ء میں جب جسٹس منیر نے تحقیقاتی عدالت میں اس خیال کا اظہار کیا کہ ۱۱۔ اگست ۱۹۴۷ء کو قائد اعظم نے جو تقریر مجلس دستور ساز میں کی تھی اس میں انہوں نے یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ پاکستان کا دستور لادینی نوعیت کا (SECULAR) ہوگا، تو میں نے اس کی مفصل تردید قائد اعظم کی ان تقریروں کے حوالے سے کی جو وہ تقسیم سے قبل اور اس کے بعد مسلسل کرتے رہے تھے۔ میری یہ تحریر اُسی زمانے میں اخبارات میں شائع ہو گئی تھی اور اب بھی وہ میری کتاب "قادیانی مسئلہ اور اس کے سیاسی، دینی و تمدنی پہلو" میں صفحہ ۱۸۸ سے ۱۹۲ تک دیکھی جا سکتی ہے۔ اب کیا یہ انصاف ہے کہ جس خیال کی تردید میں اپنی ایک شائع شدہ مفصل تحریر میں کر چکا ہوں، اسی کو میری طرف منسوب کیا جائے؟ اور کیا ضروری ہے کہ بار بار جب مجھ پر یہ الزام لگایا جائے تو ہر بار میں اس کی تردید کرتا رہوں؟

قائد اعظم کے متعلق یہ بات کس کو معلوم نہیں ہے کہ ملک کا نظم و نسق عملاً ان کے ہاتھ میں کبھی نہیں آیا؟ تقسیم کے بعد وہ صرف ۱۳ مہینے زندہ رہے، اور اس مدت کا بڑا حصہ انہوں نے بیماری کی حالت میں گزارا۔ پھر جو ابتدائی زمانہ ایسا تھا کہ جس میں وہ کچھ کام کر سکتے تھے اس میں بھی وہ قیام پاکستان کی ابتدائی مشکلات کو رفع کرنے میں تمام تر مصروف رہے۔ اس لیے جب میں کہتا ہوں کہ "جن لوگوں کے ہاتھ میں ملک کا اقتدار آیا وہ اسلامی نظام نافذ کرنے کا ارادہ ہی نہیں رکھتے تھے"، تو اس سے مراد قائد اعظم کی ذات نہیں ہوتی بلکہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو عملاً مرکز اور صوبوں میں حکمران تھے اور مختلف ادوار میں حکمران ہوتے رہے۔

"بشری کمزوریاں"

سوال:۔ ایک عالم دین کو اصرار ہے کہ لندن کی اسلامی کانفرنس والے مقالے میں آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں "بشری کمزوریوں سے بالاتر نہ ہونے" کے الفاظ جو استعمال کیے ہیں وہ درحقیقت عیب اور نقص کے معنی میں ہیں۔ کیا آپ اس کی وضاحت کریں گے کہ ان الفاظ سے خود آپ کی مراد کیا تھی؟

جواب:۔ اگرچہ میں ماہ جون کے ترجمان القرآن میں اپنی مراد وضاحت کے ساتھ بیان کر چکا ہوں، مگر اس کے بعد بھی اس الزام پر اصرار کیا جا رہا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ قائل جب اپنے قول کی صاف صاف وضاحت کر دے، تب بھی الزام لگانے والا یہی کہتا رہے گا کہ تیرے قول کا اصل منشا وہ نہیں ہے جو تو بیان کرتا ہے بلکہ وہ ہے جو ہم بیان کرتے ہیں۔ یہ عجیب رویہ ہے جو متقی اور خدا ترس لوگوں نے کبھی اختیار نہیں کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر میری طرف سے کوئی وضاحت نہ بھی ہوتی اور صرف اس مضمون کی متعلقہ عبارات ہی کو صاف ذہن کے ساتھ پڑھا جاتا تو اس غلط فہمی کی کوئی گنجائش نہ ہوتی کہ اس سلسلۂ کلام میں بشری کمزوریوں سے مراد عیوب اور نقائص ہو سکتے ہیں۔ اس میں تو ساری بحث یہ ہے کہ دوسری قوموں نے اپنے انبیاء کے حق میں جو مبالغے کیے ہیں اور ان کو خدا، یا خدا کی اولاد، یا خدا کا اوتار تک بنا ڈالا ہے، قرآن مجید نے ان سب سے مسلمانوں کو بچا لیا اور خدائی و رسالت کے درمیان ایک ایسا خط امتیاز کھینچ دیا جس سے ہر انسان یہ جان سکتا ہے کہ رسول کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ آخر اس بحث کے دوران میں یہ کہنے کا کیا موقع ہو سکتا ہے کہ رسول عیوب اور نقائص سے بالاتر نہیں ہوتا۔

علاوہ بریں اگر کوئی شخص الفاظ کے معانی کی سمجھ رکھتا ہو تو وہ بشری کمزوریوں کا مطلب عیوب اور نقائص ہرگز نہیں لے سکتا۔ انسان کے لیے "عیب" کا لفظ ایسے موقع پر بولا جاتا ہے جب وہ مثلاً بدزبان ہو، جھوٹا ہو، چغلخور ہو، فریبی اور خائن اور بدکردار ہو۔ "نقص" کا لفظ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب وہ یا تو کسی جسمانی نقص میں مبتلا ہو مثلاً بدشکل یا ناقص الاعضاء ہونا، یا وہ کسی ذہنی یا اخلاقی نقص میں مبتلا ہو، مثلاً کند ذہن، اکم فہم یا خواہشاتِ نفس سے مغلوب ہونا۔ ان دونوں کے برعکس بشری کمزوریاں یہ ہیں کہ انسان اپنی سلامتی کے لیے غذا اور پانی کا محتاج ہے۔ آرام اور نیند کا محتاج ہے۔ نکاح کا محتاج ہے۔ بیماری میں علاج کا محتاج ہے۔ دھوپ اور بارش سے بچنے کے لیے سائے کا محتاج ہے۔ سردی سے بچنے کے لیے گرم لباس کا محتاج ہے۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَخُلِقَ الْإِنسَانُ ضَعِيفًا (النساء، آیت ۲۸) "اور انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔"

صحابہؓ کے معیارِ حق ہونے کی بحث

سوال: گذارش یہ ہے کہ آپ کی علمی تحریرات سے دوسری بحثوں کے علاوہ صحابہ ذوی النجابہ کے متعلق بھی معیارِ حق ہونے نہ ہونے کے عنوان سے ایک نئی بحث چھڑ گئی ہے۔ مجھے اس اختلاف کی حقیقت سمجھ میں نہیں آتی اس لیے سخت تشویش ہے۔ فریقین کے لٹریچر پڑھنے سے جو مواد سامنے آیا ہے اس میں ثمرۂ اختلاف کہیں نظر نہیں آتا کیونکہ صحابہ کرام کو مرحوم و مغفور آپ بھی مانتے ہیں اور معصوم دوسرے حضرات بھی نہیں سمجھتے۔ نیز صحابہ کا اجماع اور مجموعی طرزِ عمل آپ کے نزدیک بھی حجت ہے اور ہر ہر صحابی کا ہر ہر فعل مطلقاً ان کے نزدیک بھی قابلِ تقلید اور حق کا معیار نہیں۔ باقی ہر صحابی کی مجموعی زندگی میں خیر کا پہلو غالب ہے اس کے فریقین قائل ہیں۔ رہی یہ بات کہ حضرات صحابہ کرام کے متعلق تاریخی ریسرچ کر کے آپ نے جو صحیح یا غلط واقعات لکھے ہیں ان کو اس بحث کی بنیاد بنایا جائے تو میرے ناقص خیال میں ان جزوی اور انفرادی واقعات کے وقوع یا عدم وقوع سے ایک خاص درجہ میں صحابہ کے معیارِ حق ہونے یا نہ ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

اس لیے اس غبار آلود بحث سے دامن بچاتے ہوئے میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ بھی ان واقعات سے قطع نظر فرماتے ہوئے خالص علمی رنگ میں خالی الذہن ہو کر معیارِ حق کا مفہوم واضح فرمائیں جس سے آپ کو انکار ہے۔ میں اپنا حاصل مطالعہ آپ کے سامنے رکھتا ہوں اگر آپ اس سے اتفاق فرمائیں تو فبہا ورنہ اس پر علمی گرفت فرمائیں۔

ظاہر ہے کہ جو کچھ کتاب و سنت کے اندر مذکور ہے اس کے لیے تو کسی مزید معیار کی ضرورت ہی نہیں بلکہ یہ خود اپنے غیر کے لیے معیار ہیں۔ مثلاً زلّاتِ صحابہ وغیرہ جن کی تفصیل بے فائدہ ہے۔ ہاں آئندہ آنے والے مسائل جن کے بارے میں قرآن و حدیث میں نفیاً یا اثباتاً کوئی صراحت موجود نہیں ایسے امورِ جزئیہ میں حضرات صحابہ کرام کے اقوال و افعال کو حجت سمجھنا چاہیے کیونکہ صحبت نبیؐ کے اثر سے ان کے قلوب و اذہان ہماری نسبت صحت و صواب کے زیادہ قریب ہیں۔ صحابہ کو شرفِ صحابیت کے علاوہ نبوت سے قوی اور قریبی تعلق رکھنے کی وجہ سے دینی و دنیاوی مسائل میں ایک قسم کی بالاتیت حاصل ہونے کو ہی معیارِ حق ہونے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ غیر صحابی کے لیے لازم ہے کہ اپنے اقوال و افعال کی صحت پر قرآن و حدیث سے کوئی دلیل قائم کرے یا کم از کم کسی صحابی کو ہی اپنی تائید میں پیش کر دے۔ لیکن صحابی کے قول و فعل کے خلاف جب تک نص سے کوئی قوی دلیل قائم نہ ہو تو اس کا صحابی سے ثابت ہونا ہی اس کی صحت کے لیے سند

ہے۔ مزید دلیل کی حاجت نہیں۔ نبوت سے غایتِ قرب کے سبب یہ اعتماد کا درجہ انہیں مل سکتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس امتیاز کی بدولت جو قربِ نبوی کے طفیل انہیں حاصل ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم انہیں غیر معصوم سمجھتے ہوئے قرآن و حدیث کا شارح سمجھیں اور جو تعبیر و توجیہ ہمارے ذہن میں آئے اس کی تصدیق و تصویب کے لیے صحابہ کے در کی دریوزہ گری کی جائے۔ حتی الامکان دین کی تعبیر میں ان سے اختلاف روا نہ رکھا جائے۔ اگر آپ اس میں کسی تفصیل کے قائل ہیں تو براہ مستدلات تحریر فرمائیں"۔

جواب:- آپ کے سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ معیارِ حق تو صرف اللہ کا کلام اور اس کے رسول کی سنت ہے۔ صحابہ معیارِ حق نہیں ہیں بلکہ اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کسوٹی سونا نہیں ہے، لیکن سونے کا سونا ہونا کسوٹی پر کسنے سے ثابت ہوتا ہے۔

صحابہ کے اجماع کو آپ بھی جانتے ہیں کہ میں حجت مانتا ہوں، بلکہ ان کی اکثریت جس جانب ہو اس کو بھی میں ترجیح دیتا ہوں۔ البتہ افرادِ صحابہ کے معاملے میں لامحالہ دو صورتوں میں سے ایک ہی پیش آسکتی ہے۔ ایک یہ کہ ان کے اقوال میں اختلاف ہو۔ اس صورت میں سب کے اقوال کو بیک وقت قبول نہیں کیا جاسکتا، بلکہ دلائل شرعیہ سے کسی قول کو دوسرے قول پر ترجیح ہی دی جاسکتی ہے، اور ان سب کے اقوال کو رد کر کے کوئی نیا قول اختیار نہیں کیا جاسکتا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کسی صحابی یا بعض صحابہ سے ایک ہی قول منقول ہو اور اس کے خلاف کوئی قول نہ ملتا ہو۔ اس صورت میں صحیح بات یہی ہے کہ اسے قبول کیا جائے اور اس قول کو رد کر کے کوئی دوسرا قول اختیار نہ کیا جائے، الا یہ کہ جلیل القدر تابعین اور مسلّم ائمہ مجتہدین نے دلائل کی بنا پر اس میں کلام کیا ہو اور وہ دلائل اقرب الی الصواب محسوس ہوں۔

بینک میں رقم رکھوانے کی جائز صورت

سوال:- بینک میں رقم جمع کرنے کے معاملے میں میرا سوال یہ ہے کہ اگر میں سیونگ اکاؤنٹ میں رقم جمع کراتا ہوں تو بینک اس پر سود دے گا۔ لیکن اگر کرنٹ اکاؤنٹ میں رقم جمع کرائی جائے تو اگرچہ اس پر مجھے سود نہیں ملے گا مگر بینک اس رقم کو سودی کاروبار میں استعمال کرے گا۔ گویا میری رقم پر بینک تو سود لے گا۔ اس کے بجائے میں یوں کیوں نہ کروں کہ سیونگ اکاؤنٹ میں رقم جمع کراؤں اور اس پر

(باقی بر صفحہ ۴۵)

مطبوعات

جام طہور | مصنف: مولوی عبدالرحمٰن صاحب عاجز مالیر کوٹلوی۔

رحمانیہ دارالکتب - امین بازار لائل پور۔

صفحات: ۴۴۴ قیمت عام: -/۲۴ روپے جہیز ایڈیشن: -/۴۰ روپے

ایمیٹش آرٹ پیپر پر نہایت خوبصورت حاشیہ کے ساتھ یہ کتاب مصنف نے خود طبع کرائی ہے۔ کتاب کے دو حصے ہیں حصہ نثر اور حصہ نظم۔ کتاب کے آغاز میں چند اہل قلم کی تقریظات درج ہیں جن میں مولانا غلام رسول مہر مرحوم اور جناب احسان دانش کے نام قابل ذکر ہیں۔ مصنف نے آغاز کتاب میں موت کو یاد رکھنے پر بہت زور دیا ہے اور پھر شعرائے کرام کی خدمت میں گذارش کی ہے کہ وہ حسان بن ثابتؓ کے انداز میں شاعری کریں اور مبالغہ اور خرافات سے بچیں۔ اس کے بعد شاعری کے متعلق اسلامی نقطہ نگاہ بیان کرنے کے بعد اپنی شاعری کے متعلق لکھا ہے کہ اس سے مقصود فنی شاعری اور تغزل نہیں ہے بلکہ محض تبلیغ دین ہے اور اپنے بارہ سالہ قیام مکہ کے حالات لکھے ہیں۔ حصہ نظم میں بعض نظمیں بہت اچھی ہیں۔ حمد و نعت کے مضامین جائز حدود کے اندر رہتے ہوئے بہت خوب بیان کیے ہیں۔ البتہ متعدد اشعار شعریت سے خالی ہیں۔

کتاب کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کاپیاں پڑھنے میں پوری احتیاط نہیں برتی گئی چند مقامات درج ذیل ہیں:۔

صفحہ ۱۳۳ پر ہجرت کے وقت مکہ سے نکلنے کی عیسوی تاریخ ۱۲ ستمبر ۶۲۱ء اور صفحہ ۱۳۴ پر غار ثور سے مدینہ روانہ ہونے کی تاریخ ۱۶ ستمبر ۶۲۲ء درج ہے ظاہر ہے کہ پہلی تاریخ میں کتابت کی غلطی ہے۔ اسی طرح صفحہ ۱۴۵ پر فاصلہ کے بجائے فیصلہ لکھا گیا ہے۔ صفحہ ۱۵۱ پر دریدہ دہنوں کی جگہ دیدہ دہنوں چھپ گیا ہے۔ صفحہ ۱۵۲ پر عتبہ اور شیبہ کے بجائے عتبہ بن شیبہ لکھا ہوا ہے۔ صفحہ ۱۵۴ پر اعوذ بنور وجهك الذی کا ترجمہ "تیری ذات کے نور سے پناہ چاہتا ہوں" کیا گیا ہے جو غلط ہے۔

محترم شاعر کے بعض اشعار ایسے ہیں جنہیں اس مجموعہ سے نکال دینا چاہیے۔ مثال کے طور پر:۔

- تم کو ہیں آ کے ملوں جام شہادت پی کر — تہ شمشیر رہوں یا میں تہ دار رہوں
- اے مرد مجاہد تو بڑھا چل تو بڑھا چل — یہ سیل رواں دیکھ نہ وہ کوہ گراں دیکھ
- پہنچائے وہ ترے کاروان کو خاک منزل پہ — جو خود آوارہ ہو گم گشتہ راہ کارواں ہو کر
- اللہ کے ولیوں کی یہ پہچان ہے اے دوست — دیتے ہیں دعا سن کے وہ دشنام ہمیشہ
- ایک مسلم کا ذہن ہے عطر دان اسلام کا۔

  اسلام کا عطر دان کس قدر عجیب ترکیب ہے۔
- خود بخود ہو جائے گا روشن حساب زندگی۔
- تیرے ہر ایک کام سے ہے وہ خبیر باخبر — دن کی روشنی میں ہو یا وہ شبِ سیاہ میں
- اسی طرح اخیر وقت (صفحہ ۳۹) اردو میں مستعمل نہیں۔

جاگو اور جگاؤ مصنف: راز کاشمیری

ضخامت: ۸۰ صفحات سائز: ۲۷ × ۱۷ قیمت: پانچ روپے

پبلشر:۔ سدا بہار پبلیکیشنز گنپت روڈ۔ لاہور

"جاگو اور جگاؤ" طلبا کے لیے اسلامی، اصلاحی اور اخلاقی نظموں کا مجموعہ ہے۔ عبدالمنان راز کاشمیری ایم اے اس کے مصنف ہیں جو ایک معروف شاعر ہیں۔ بچوں کے لیے انہوں نے خاص طور پر بہت لکھا ہے۔

جاگو اور جگاؤ صوری اور معنوی لحاظ سے قابل قدر اور دلکش کتاب ہے۔ راز کاشمیری صاحب نے کتاب کے آغاز میں لکھا ہے کہ ان نظموں کے سلسلہ میں ان کے پیش نظر تین مقاصد ہیں:۔

۱۔ اسوہ حسنہ کی روشنی میں بچوں کی تعمیر سیرت۔

۲۔ طلبا میں نظریہ پاکستان کا شعور پیدا کرنا۔

۳۔ طلبا کو اچھے مسلمان شہری بنانا۔

اور یہ حقیقت ہے کہ وہ ان مقاصد کو پیش کرنے میں پوری طرح کامیاب رہے ہیں۔ موضوعات اسلامی، اخلاقی اور قومی ہیں۔ جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے سادہ، سلیس اور دلکش ہے۔

سدا بہار پبلیکیشنز نے "جاگو اور جگاؤ" نہایت اہتمام سے شائع کی ہے۔ پوری کتاب دو رنگی کتابت و طباعت سے مزین ہے۔ ہر صفحہ پر تصاویر اور فطری مناظر ہیں۔ سرورق چار رنگا ہے اور بچوں کے مزاج اور نفسیات کے لحاظ سے نہایت خوبصورت اور پرکشش ہے۔ کاغذ سفید عمدہ، سرورق آرٹ پیپر پر ہے۔

بچوں کے ادب میں خاص طور پر مغربی ادب میں اتنی خوبصورت کتاب اب تک شائع نہیں ہوتی۔ ہم اس کتاب کے مطالعہ کی پرزور سفارش کرتے ہیں۔

WHITHER ASIA ایشیا کی منزل	مصنف: پروفیسر محمود بریلوی صاحب۔ صفحات: ۲۱۳ قیمت: ۲۲ روپے ۵۰ پیسے

ناشر: پروفیسر محمود بریلوی - پوسٹ آفس بکس ۵۲۹۲ - کراچی ۲

پاکستان براعظم ایشیا میں واحد ایسی ریاست ہے جو ایک عقیدہ اور نظریہ کی بنا پر معرض وجود میں آئی ہے۔ لیکن جس خطۂ ارض میں یہ نظریاتی ریاست واقع ہے اس کی فضا نہ صرف اس کے موافق نہیں ہے بلکہ سخت مہلک بھی ہے۔ یہ ریاست چاروں طرف سے دوسرے نظریات کی حامل قوموں کی یلغار کی زد میں ہے۔ لہذا پاکستان کے تحفظ و بقا کے لیے ضروری ہے کہ اس کے گرد و پیش میں وقتاً فوقتاً جو سیاسی اور تہذیبی تغیرات رونما ہوتے رہتے ہیں ان کا گہرا جائزہ لے کر عوام کو ان سے روشناس کرایا جائے۔

زیر تبصرہ کتاب اسی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ اس میں براعظم ایشیا کے مختلف ممالک میں ابھرنے والی تحریکوں کا ایک مختصر مگر فکر انگیز جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ کتاب میں ہر ملک کے بارے میں مفید معلومات جمع کر دی گئی ہیں۔ مثلاً رقبہ، آبادی، قدرتی وسائل اور مختلف ممالک کی تحریک ہائے آزادی کے محرکات اور عوامل کا تذکرہ ملتا ہے۔ ایک پاکستانی کے نقطۂ نظر سے کتاب کا وہ حصہ نہایت اہم ہے جس میں پاکستان اور بنگلہ دیش کے حالات کا تذکرہ ہے۔ اس کے مطالعہ سے تحریک پاکستان میں علماء کے کردار اور سقوط مشرقی پاکستان کے سیاسی عوامل پر روشنی پڑتی ہے۔ کتاب میں اشتراکی عناصر کی سرگرمیوں اور طریق کار اور بڑی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کا تذکرہ بھی موجود ہے۔

روس اپنے "ایشیائی سلامتی تنظیم" کے بارہ میں اپنے سیاسی دائرہ اثر کو جس سرعت اور چابکدستی سے وسعت دے رہا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے جو حربے اور ہتھکنڈے استعمال کر رہا ہے اس کی ایک نمایاں جھلک کتاب میں نظر آتی ہے۔ کتاب صرف معلومات کا ایک بے روح مجموعہ نہیں بلکہ اس میں مسلمانوں کے لیے اپنے دینی اور ملی تشخص کے حفظ و بقا کی جدوجہد اور سعی و عمل کی تحریک بھی موجود ہے۔

ہمارے خیال میں اس کتاب کا مطالعہ پاکستان کے ہر پڑھے لکھے شہری کو کرنا چاہیے۔ تاکہ وہ اپنے دشمنوں کی سازشوں سے واقفیت حاصل کر کے اپنے تحفظ و دفاع کے لیے مناسب اقدامات کر سکے۔

مناظر قیامت مترجم	تالیف: سید قطب شہید مترجم: محمد نصر اللہ خان صاحب خازن صفحات: ۳۵۸ طباعت: آفسٹ کاغذ عمدہ سفید

ناشر: مکتبہ ظفر گجرات پاکستان - قیمت: ۱۶ روپے ۵۰ پیسے

سید قطب شہید کی ذات کسی مسلمان کے لیے محتاج تعارف نہیں۔ وہ ایک بہت بڑے عالمِ دین مفکر اور صاحب طرز ادیب اور انشاء پرداز ہیں۔ ان کی تحریریں دلوں کو گرماتی ہیں اور ذہن کو علم و ایقان سے مالا مال کرتی ہیں۔ ان کی فکر اسلامی اور ان کا استدلال محکم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کتابیں قبولِ عام حاصل کر رہی ہیں اور مختلف زبانوں میں ان کے تراجم ہو رہے ہیں۔ ان کی جن کتابوں کا اُردو ترجمہ شائع ہو چکا ہے وہ یہ ہیں۔ "جادہ و منزل"، "اسلام کا روشن مستقبل"، "امن عالم اور اسلام" اور "قرآن اور دعوت انقلاب"۔ اب جناب محمد نصر اللہ خان صاحب خازن نے اُن کی عربی تصنیف "مشاهد القيامة في القرآن" کو اُردو قالب میں "مناظر قیامت" کے عنوان سے پیش کیا ہے۔

کتاب کے پہلے باب میں سید قطب شہید نے مختلف ادوار اور اقوام میں قیامت کے بارے میں جو مختلف اعتقادات اور تصورات پائے جاتے تھے اُن کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور اس تقابلی مطالعہ کے بعد اسلام کا حیات آفرین اور صاف و شفاف عقیدہ بیان کیا ہے جس سے اسلام کے عقیدہ کی صداقت و حقانیت واضح ہو جاتی ہے۔

کتاب کے مصنف کے بقول "مشاہدِ قیامت" سے مراد زندگی بعد موت، محاسبۂ اعمال، جنت اور

دوزخ ہے۔ لہٰذا اس کتاب میں صرف قیامت کے احوال ہی کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ جنت کے انعام واکرام اور نعمتوں اور آسائشوں کا دلکش بیان بھی ہے اور دوزخ کی ہولناکیوں، اُس کی عقوبت خانوں کی رُوح فرسا اور زہرہ گداز منظر کشی بھی کی گئی ہے۔ کتاب میں قیامت اور جنت و دوزخ کے احوال کا صرف سادہ بیان ہی نہیں ہے بلکہ انہیں محسوس، زندہ و متحرک اور اُبھرتی ہوئی نمایاں شکل میں پیش کر کے ان کی مکمل و مجسّم تصویر لوگوں کے سامنے پیش کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مختلف مناظر انسان کے جسم و رُوح پر جو اثرات مترتب کرتے ہیں ان کو بھی اجاگر کیا گیا ہے اور ہر منظر کا نفسیاتی پس منظر بھی نہایت حکیمانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

جناب خازن صاحب نے اس قابلِ قدر کتاب کی ترجمانی کا حق ادا کر دیا ہے۔ کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے کسی مقام پر محسوس نہیں ہوتا کہ یہ کتاب کسی کتاب کی ترجمانی ہے۔ زبان شُستہ، رواں اور ادبی ہے۔ خازن صاحب اپنی اس کاوش پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ کتاب کی کتابت و طباعت بھی اُس کے علمی مقام کے شایانِ شان ہے۔

(بقیہ رسائل و مسائل)

جو سود مجھے ملے اسے حاجت مندوں کی ضروریات پر صرف کروں؟ وہ سود بینک کیوں کھائے؟ کسی ضرورت مند کی ضرورت کیوں نہ پوری کر دی جائے؟ اس معاملے میں میری رہنمائی فرمائی جائے۔

جواب:- روپیہ اگر کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھا جائے تو اس پر کوئی سود نہیں لگتا اور بینک کے لیے کرنٹ اکاؤنٹ کی رقم اپنے کاروبار میں استعمال کرنا خلاف قاعدہ ہے۔ اب اگر وہ اسے سودی کاروبار میں استعمال کرتا ہے تو اس کی ذمہ داری ہم پر نہیں ہے کیونکہ ہم تو اس کے پاس حفاظت کے لیے اپنا روپیہ رکھتے ہیں نہ کہ سودی کاروبار کے لیے۔ اس کے برعکس اگر آپ اپنا روپیہ کسی ایسی مد میں جمع کراتے ہیں جس پر آپ کو سود ملتا ہے اور مقصد آپ کا یہ ہوتا ہے کہ اس سود کو غریبوں کی مدد کے لیے استعمال کریں تو یہ ایسا ہی ہوگا جیسے ایک شخص لوگوں کی جیبیں اس غرض کے لیے کاٹے کہ اس سے جو روپیہ ملے گا اس کو وہ غریبوں کے لیے استعمال کرے گا۔

(بقیہ اشارات) لازماً عدالت سے رجوع کی حاجت نہیں۔ فریقین چاہیں تو آپس کی مفاہمت و مصالحت سے یہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ بات کہ خاوند اگر طلاق یا خلع دینے پہ تیار نہ ہو تب بھی عدالت سے تفریق نکاح کی ڈگری لیے بغیر بیوی اپنے آپ کو یا اپنے خاوند کو طلاق دے کر بندشِ نکاح سے آزاد ہو سکتی ہے، یہ ایک ایسی لغو اور بے بنیاد بات ہے جس کے حق میں قرآن، حدیث، یا فقہ کے ذخیرے میں ذرہ برابر بھی کوئی دلیل ثبوت موجود نہیں ہے۔ مگر کمیٹی کے ارکان کو اسی غلط اور غیر اسلامی موقف پر برابر اصرار ہے۔ چنانچہ دفعہ ۳۵ کے آخر میں پھر یہ کہا گیا ہے:

"کمیٹی یہ سفارش کرتی ہے کہ فیملی لاز آرڈی نینس کی دفعہ ۸ میں اس طرح ترمیم کی جائے کہ جب بیوی بذریعہ خلع اپنے خاوند سے رہائی کی خواہش مند ہو تو وہ چیئرمین کو (یا عائلی عدالت کے صدر کو) نوٹس دے دے کہ وہ خاوند کو ادا ہونے والے مالی معاوضہ کی مقدار مقرر کر دے۔ چیئرمین اس معاوضے کے تعین کے بعد دفعہ ۷ کے تحت مصالحتی کارروائی کا آغاز کر دے گا اور مصالحت کی ناکامی کی صورت میں عورت کے نوٹس یا وضع حمل کے نوے دن بعد نکاح زائل اور کالعدم قرار پائے گا۔"

یہاں "بذریعہ خلع" کے الفاظ کا استعمال محض تکلفاً کیا گیا ہے، یا پھر ان سے غرض مغالطہ آفرینی ہے، ورنہ کمیٹی کا اصل مدعا یہ ہے کہ بیوی جب چاہے اپنے خاوند پر طلاق وارد کر دے۔ لیکن اس کے ساتھ اگر خاوند کچھ مال بھی وصول کرنا چاہے تو اس کی وصولی خاوند کی مجرد خواہش کے بل پر نہیں ہو سکتی بلکہ اس معاملے میں عدالت کو استعمال کیا جائے گا۔ چنانچہ عدالت یہ خدمت انجام دے گی اور اس کے بعد پھر مصالحتی کارروائی شروع کرے گی۔ سوال یہ ہے کہ اب تک آپ اس پر زور دے رہے ہیں کہ خلع کے لیے کسی عدالتی کارروائی کی حاجت نہیں، تو پھر اگر یہ آپ کے بقول "رہائی بذریعہ خلع" ہے تو اس میں یہ عدالتی اور مصالحتی کارروائی کہاں سے نکل آئی۔ طلاق کے بعد، اگر وہ رجعی ہو، تو رجوع کا سوال پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن خلع اور عدالتی تفریق تو طلاق بائن کا اثر رکھتی ہے جس کے بعد کسی مصالحت اور رجوع کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی، پھر یہ کیسی مصالحتی کارروائی اور اس کی ناکامی یا کامیابی ہے جس کا ذکر آپ فرما رہے ہیں۔ آپ اپنے دل کی بات کو صاف صاف زبان پر لائیے اور سیدھی طرح کھل کر کہیے کہ بیوی جب چاہے اپنے خاوند کو طلاق رسید کر سکتی ہے۔ لیکن خاوند اگر طلاق کے ساتھ کسی مالی معاوضے کا مطالبہ کرتا ہے، تو اس معاوضے کی تعیین

عدالت کے ذریعے سے ہو گی۔

حقیقت یہ ہے کہ رپورٹ کی اس دفعہ ۳۵ میں عورت کو یک طرفہ ازالۂ نکاح کا جو حق دیا جا رہا ہے اس کا اسلام کے تجویز کردہ طریق خلع سے کوئی دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ یہ ایک طرح کا دھوکا اور مغالطہ ہے جو خدا کے دین اور اس کے پیرووں کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ مگر یہ چالبازی انشاء اللہ ناکام ہو گی۔ چونکہ رپورٹ میں قرآن و سنت اور اجماعِ فقہاء کا ذکر موجود ہے، اس لیے دل میں یہ خیال بھی آرہا ہے کہ شاید کچھ پردہ نشین علماء و فضلاء ایسے ہوں جو شریک مشورہ رہے ہوں مگر ان کے نام ظاہر نہ کیے گئے ہوں۔ اگر یہ گمان غلط ہے تو اللہ ہمیں معاف فرمائے اور اگر صحیح ہے تو ان حضرات کے اسمائے گرامی پردۂ خفا میں نہیں رہنے چاہییں تاکہ پوری قوم اس رپورٹ کے مصنفین سے آگاہ ہو اور انہیں پہچان لے۔ اس سلسلے میں ایک بات کا مزید ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ حکومت نے خود اپنے دامنِ عاطفت میں ایک ادارہ، ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کے نام سے قائم کر رکھا ہے۔ ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن پی ایچ ڈی مستقلاً اس ادارے سے "بحیثیت مشیر قانون" وابستہ ہیں اور وہ مجموعۂ قوانینِ اسلام کے نام سے ایک ضخیم کتاب مرتب کر رہے ہیں جس کی پانچ جلدیں اب تک یہی ادارہ چھاپ چکا ہے۔ اس کتاب کی جلد دوم میں طلاق، خلع، تفریق وغیرہ عائلی مسائل پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ خلع و مبارات کی بحث ص ۵۰۰ سے لے کر ص ۶۰۹ تک پھیلی ہوئی ہے۔ اگر اس رپورٹ کے ارکان، بالخصوص کمیٹی کے فاضل صدر کا اطمینان ہماری گذارشات سے نہ ہو تو انہیں چاہیے کہ وہ اس کتاب کا مطالعہ فرمائیں۔ شاید اس طرح انہیں اپنے غلط موقف کا احساس ہو اور وہ اس پر جمے رہنے کے بجائے حق کی جانب رجوع کر سکیں۔

سرِدست ہم اس کتاب کا ایک اقتباس یہاں نقل کیے دیتے ہیں جو اس کے صفحہ ۵۹۲ پر "خلع اور حکمِ عدالت" کے زیرِ عنوان درج ہے اور وہ یہ ہے:

> "امام بخاری نے لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلع کو جائز کیا ہے اگرچہ وہ سلطان کے سامنے نہ ہو۔ عام علماء کے نزدیک بھی خلع کے جائز ہونے کے لیے سلطان (حاکم وقت) کا موجود ہونا شرط نہیں۔ امام کاسانی نے بھی اسی نظریہ کو صحیح لکھا ہے۔ احناف، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کا بھی یہی

قول ہے۔ قاضی شریح، زہری اور اسحاق کا بھی یہی قول ہے۔ ابن قدامہ مقدسی نے اس کی دلیل یہ بیان کی ہے کہ چونکہ خلع عقدِ معاوضہ ہے لہٰذا جس طرح نکاح اور قطعِ عقد باہمی رضامندی سے ہوتا ہے اور جس طرح ایسے دوسرے عقود میں حاکم کی موجودگی شرط نہیں ہے، اسی طرح خلع میں بھی شرط نہیں ہے۔

لیکن فقہاء کے نزدیک خلع کے لیے حاکمِ وقت کی موجودگی ضروری نہ ہونے کا صرف یہ مطلب لیا جائے گا کہ فریقین باہمی خلع کرنا چاہیں تو اس کے جواز کے لیے حکمِ حاکم یا قاضی کی شرط نہیں۔ چنانچہ اگر فریقین باہمی رضامندی سے علٰحدگی اختیار کرنا چاہیں تو اس کو فقہی اصطلاح میں مبارات کہا گیا ہے جو خلع کے حکم میں ہے۔ لیکن اگر فریقین میں ناچاقی ہو تو اس کا فیصلہ کہ وہ حدود اللہ کو قائم نہ رکھ سکیں گے اور خلع کرنا چاہیے، یہ کوئی تیسرا شخص ہی کر سکتا ہے۔ اور ایسی صورت میں خلع عدالت کے ذریعے کرایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اگر عورت رشتۂ زوجیت کو منقطع کرنا چاہے اور مرد کو اس کا بدل دینے کے لیے آمادہ ہو تو اسلام مذکورہ شرائط کے ساتھ عورت کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ حاکمِ وقت یا اس کی قائم کردہ عدالت میں حاضر ہو کر استغاثہ پیش کرے اور بذریعہ عدالت شوہر سے خلع حاصل کرے۔ قرآن کی آیت: فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا یُقِیۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰہِ اور ثابت بن قیس کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم دینا کہ تم اپنا باغ (یا دو باغ) واپس لے لو اور زوجہ کو طلاق دے دو، اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ زوجین میں ناچاقی کی صورت میں عورت کی درخواست پر خلع کرانا عدالت کا فرض ہے جبکہ وہ اس پر مطمئن ہو جائے کہ فریقین کے لیے باہمی معاشرت میں احکامِ خداوندی کی پابندی کرنا ممکن نہیں ہے۔ ثابت بن قیس کے معاملے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ یقیناً اسلام کے سب سے پہلے قاضی کی حیثیت سے تھا۔"

اپنی سابق تحریر و تنقید لکھتے وقت ہمارے سامنے ڈاکٹر صاحب موصوف کی یہ عبارت نہیں تھی لیکن اب اسے پڑھ کر بآسانی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کی اور ہماری بات میں کتنا توافُق و تطابُق ہے اور خلع کے پردے میں عقدۂ نکاح کو حل یا قطع کرنے کا جو اختیار یہ کمیٹی عورت کے ہاتھ میں دینا چاہتی ہے وہ کتاب و سنت اور فقہ اسلامی کی نگاہ میں کتنا غیر مشروع اور بے جواز ہے۔ ہاں البتہ اہلِ مغرب کی کورانہ تقلید میں اگر مرد و زن کو طلاق کے معاملہ میں مساوات عطا کرنا مقصود ہے اور عدالت کا کام فقط یہ ہے کہ وہ مرد یا عورت کی طرف سے دی گئی طلاق کا بس اعلان و استقرار کر دے اور زوجین کے مالی واجبات کی جمع و تفریق کا حساب کر دے تو یہ بات بالکل دوسری ہے۔ (باقی)